# حیاتِ امجد

حکیم الشعراء سعدیِ دکن، سرمدِ ثانی
حضرت سید احمد حسین امجدؔ حیدرآبادی
کے حالاتِ زندگی اور ان کی ادبی خدمات
کا جائزہ



محمد جمال شریف
ایم۔ اے۔ (علیگ)

ALIGARH BOOK DEPOT
Qazi Para, ALIGARH.

مُصنّف:- محمد جمال شریف
ایم۔ اے (علیگ) ریسرچ اسکالر

کتابت:- . . . . . . کرم نویس رشید نواب

طباعت:- اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد۲





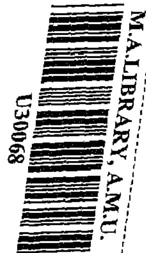
بارِ اوّل:- . . . . اپریل ۱۹۶۱ء

تعداد:- . . . . . . (۵۰۰)

قیمت:- . . . . . . (چار روپیے)

ملنے کا پتہ

مکان محمد تلاوت شریف صاحب منتظم دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل
ملک پیٹھ قدیم۔ عقب مارکٹ۔ حیدرآباد (اے۔پی)





# فہرست مضامین

# تعارف

حضرت امجد حیدر آبادی اس دور میں اردو زبان کے بڑے نامور اور قادر الکلام شاعر اور ادیب ہیں، جناب محمد جمال شریف صاحب نے موصوف سے متعلق یہ پُرمغز، جامع، اور مبسوط مقالہ لکھ کر اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ زبان و بیان کی خوبی اور عمدگی کے علاوہ لائق مضمون نگار نے مقالہ کی ترتیب اس انداز پر کی ہے کہ اُس کے مطالعے کے بعد حضرت امجد کی دلکش اور حسین شخصیت کے خدوخال بھی پوری طرح اُجاگر ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی موجودہ اردو شعرا میں اُن کا صحیح مرتبہ و مقام، اُن کی شاعرانہ خصوصیات اور نثر پر قدرتِ کاملہ اور نثر و نظم میں اُن کے تمام کارنامے بیک وقت نظر کے سامنے آجاتے ہیں، مواد کی کثرت، اُس کی حُسنِ ترتیب اور شگفتگی بیان کے لحاظ سے اس لائق ہے کہ اردو شعر و ادب کا ہر طالبِ علم اس کا مطالعہ کر کے لائق مضمون نگار کی محنت اور حُسنِ ذوق کی داد دے فقط

سعید احمد اکبر آبادی
کلکتہ۔ ۲۴ر جون ۱۹۵۹ء

# رُباعی

ہر شخص کے دل کو خوش رکھو عید یہ ہے
ہر چیز کو اچھا کہو تمجید یہ ہے
مخلوقِ خدا ہے سب خدا کی مخلوق
سب کو تم ایک سمجھو توحید یہ ہے



# حرفِ اوّل

۲۹ مارچ ۱۹۶۱ء کی رات دس بج کر تیس منٹ پر اردو شاعری کی ایک اور جگمگاتی شمع گل ہو گئی۔ کس کو خیال تھا کہ حضرت امجد اس وقت زندگی کے ۷۷ مرحلوں سے گزر چکے ہیں اور اب ان کی ابدی زندگی کا آغاز ہونے والا ہے۔ آج سے ٹھیک پانچ برس پہلے جب میں نے حضرت امجد کی زندگی اور شاعری پر لکھنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلے میں ان سے اکثر ملا کرتا تو میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایک دن مجھے ان کی موت کا بھی ماتم کرنا پڑے گا اور وہ وقت اس قدر قریب ہی ہے۔ میری اس وقت سے تمنا تھی کہ ان اوراق پریشاں کو کسی طرح حضرت امجد کی زندگی ہی میں طبع ہونے اور اُن کی نذر کرنے کی سعادت مل جاتی لیکن مشیّت نے جو فیصلہ بہت پہلے کر دیا تھا اس کے آگے اس تمنا کی حقیقت ہی کیا۔ پھر بھی میرے لیے یہ احساس ہی اس وقت بہت ہے کہ ان کی زندگی ہی میں، میں اس فرض سے سبکدوش ہو چکا تھا اور اس کتاب کے بہت سے مرحلوں پر خود حضرت امجد کی تصدیق و تائید مجھے حاصل ہو چکی تھی۔

امجد اُردو ادب کا ایک بہت قیمتی سرمایہ تھے۔ اس لیے نہیں کہ انھوں نے اُردو شاعری کی ایک خاص صنف رباعی کو اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا اور اسی صنف کو مالا مال کرنے میں اپنی ساری عمر صرف کر دی

بلکہ اس لیے بھی کہ ان کی شاعری اور ان کی عملی زندگی میں جو مکمل یگانگت اور ہم آہنگی نظر آتی ہے وہ اُردو کیا، دُنیا کے بہت کم شاعروں کے ہاں ملتی ہے۔ عام طور پر یہ ایک طرح کا شاعرانہ دستور سا ہو گیا ہے کہ شاعر اپنی عملی زندگی کو اپنے اشعار کے مطابق بنانے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ وہ باتیں تو اخلاق و انسانیت، روحانی اور تمدنی اقدار کی کرتا ہے لیکن خود اس کی عملی زندگی ان بلند آہنگ دعوؤں سے کوسوں دور ہوتی ہے۔ اس کے کردار اور اس کی شاعرانہ لن ترانیوں میں سراسر دوئی اور غیریت پائی جاتی ہے۔ ایسے شاعر بہت کم ہوں گے اور اس زمانے میں تو شاذ ہی کوئی نظر آئے جس کی شاعری اور زندگی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ سراپا ہم آہنگ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ زبان و بیان کی ساری نزاکتوں اور خیالات کی تمام رفعتوں کے باوجود ان کا کلام اس سوز اور اس درد سے عاری ہوتا ہے جو دل کا مقدر ہے اور انسانیت کی نجات اگر کہیں ممکن ہے تو اسی سوز دروں اور خلشِ باطنی میں۔ حضرت امجد اس حیثیت سے یقیناً بہت سے قدیم اور معاصر شعراء میں ممتاز ہیں کہ ان کے کلام اور ان کے کردار میں کوئی تضاد اور کوئی تخالف نہیں۔ وہ صوفی منش اور قلندر صفت انسان تھے۔ قرآن اور حدیث کے گہرے مطالعے اور مذہب سے ان کے عشق و انہماک نے ان کو احساس و ادراک کی اس منزل پہنچا دیا تھا جہاں زندگی کے معنی اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ ذہن پر کھل جاتے ہیں جہاں انسان محض اپنے ملک اور اپنے زمانے کا پابند نہیں رہ جاتا بلکہ وہ

آنے والے زمانوں اور انسانوں کے لیے ایک تہذیبی اور تمدنی ورثہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

ایک عظیم شاعر کی طرح امجد نے زندگی کو جس نظر سے دیکھا، جس طرح محسوس کیا اور خود اپنی روزمرہ کی انفرادی اور سماجی زندگی میں جس طرح برتا ٹھیک اسی طرح اس کو انھوں نے اپنی شاعری میں سمو دیا۔ تصوّف ان کا دن رات کا مشغلہ اور قرآنی تعلیمات ان کی ساری زندگی کا محور اور مرکز رہا۔ اسی نے ان کو ایک عام انسان اور ایک عام شاعر کی سطح سے اٹھا کر اس مقام پر پہنچایا جہاں انسانیت کا ایک آفاقی تصور اپنی پوری معنویت کے ساتھ روشن ہو جاتا ہے۔ رنگ و نسل اور مذہب و عقیدے کے سارے امتیازات مٹ جاتے ہیں اور انسان ساری کائنات کے دل کی دھڑکنیں سننے لگتا ہے۔ حضرت امجد کی شاعری کو محض تصوّف کی شاعری کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ امجد نے جو بات کہی ہے اور جس سطح سے کہی ہے اگر اس کو دیانت داری اور کشادہ دلی کے ساتھ عملی زندگی میں برتا جائے تو مجھے یقین ہے کہ ہمارے بہت سے مادّی اور رُوحانی امراض کے لیے تریاق ثابت ہو۔ آخر امجد نے شاعری اس لیے تو نہیں کی تھی کہ ان کا کلام سن کر لوگ سر دھنیں اور لطف اٹھائیں۔ اس کے لیے داغ کا کلام کیا کافی نہیں ہے۔ امجد کی شاعری کی قیمت اسی لیے ہے کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعے انسان کو انسانیت کے نصب العین کی طرف بلاتے رہے اور جب تک ان کا کلام زندہ رہے گا وہ بلاتے رہیں گے۔

اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا کلام زندہ نہیں رہے گا۔

حضرتِ امجد پر قلم اُٹھانے کی تحریک مجھے اس لیے بھی ہوئی کہ میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا اور جس چیز نے مجھے ان کا گرویدہ کیا اور ان کی بڑائی اور عظمت کے احساس کو دوبالا کیا وہ یہی فکر و عمل کا مکمل آہنگ و اتحاد تھا۔

محمد جمال شریف

۱۷ اپریل ۱۹۶۱ء

# پہلا باب

## حالاتِ زندگی

# رُباعی

دُنیا کے ہر اک ذرّے سے گھبراتا ہُوں
غم سامنے آتا ہے جدھر جاتا ہُوں
رہتے ہوئے اس جہاں میں مدّت گزری
پھر بھی اپنے کو اجنبی پاتا ہُوں

---

**پیدائش**

"ابوالاعظم" سید احمد حسین امجدؔ، ۶؍رجب سنہ ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) روز دوشنبہ بوقت صبح حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صوفی سید رحیم علی ابنِ سید کریم حسین مرحوم اپنے وقت کے بڑے نیک اور خدا رسیدہ بزرگ تھے جنھیں یکے بعد دیگرے چار بیویوں سے اکیس بچے پیدا ہوئے۔ بیس مر گئے اور اکیسویں امجدؔ ہیں۔

امجدؔ کے والد کے انتقال کا واقعہ بہت دردناک ہے۔ امجدؔ ابھی چالیس دن ہی کے تھے کہ رسمِ چلّہ کے دن ان کے والد کا بعد نمازِ فجر مسجد سے گھر واپس ہوتے ہوئے قلب پر فالج کے اثر سے یکایک انتقال ہو گیا۔ چلّہ کی رسم میں مہمانوں سے بھرا ہوا گھر دم بھر میں ماتم کدہ بن گیا۔ جو پانی زچہ و بچہ کے نہلانے کے لیے گرم کیا گیا تھا وہ غسلِ میت کے کام آیا۔

امجد کی والدہ صوفیہ نے بہ مشکل سہاگ کے تین سال گزارے تھے کہ عین جوانی میں بیوہ ہوگئیں۔ یہ بہت نیک۔ خدا ترس اور پاک طینت بی بی تھیں۔ صوم وصلواۃ کی پابند اور نہایت سادہ مزاج تھیں۔ گھر کا کام کاج خود کرتیں۔ امجد کی پیدائش سے پہلے ان کی ایک لڑکی مر چکی تھی۔ ابھی یہ زخم تازہ ہی تھا کہ شوہر نے بھی داغِ مفارقت دیا۔ اب گھر کا چراغ صرف امجد ہی تھے۔ غم نصیب بیوہ ماں نے اس لختِ جگر کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

**بچپن**

امجد ابھی تین برس ہی کے تھے کوئلہ سے دیوار پر کاغذ پر تختے پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچا کرتے اور مٹاتے۔ یہ دیکھ کر ماں پوچھتیں کہ بیٹا کیا کر رہے ہو۔ امجد معصومانہ جواب دیتے "لکھ لے لکھ لے پوچھ لے پوچھ لے۔" یعنی لکھ رہے ہیں اور پونچھ رہے ہیں۔

امجد بچپن میں بہت شریر تھے سلیقے سے چنے ہوئے سامان کو اُلٹ پلٹ کرتے اور توڑ پھوڑ دیتے۔ نہ ہاتھ کو چین تھا نہ پاؤں کو۔ کبھی سالن میں راکھ اور کبھی راکھ میں سالن ڈال دیتے۔ گرما میں ٹھنڈے پانی کی صراحیاں اُلٹ کر اپنا دل ٹھنڈا کرتے۔ شرارت کا یہ عالم تھا کہ اگر فقیر کو دینے کے لیے پیسہ دیا جاتا تو خود لے کر رفوچکر ہو جاتے۔

امجد کو بچپن میں پڑھنے لکھنے کا شوق نہ تھا۔ ان کی والدہ تعلیم کی دلدادہ تھیں۔ اور امجد کھیل کود پہ مائل۔ ماں کو علم سے محبت تھی اور امجد کو لکھنے پڑھنے سے وحشت۔ والدہ پڑھنے بٹھائیں تو امجد کچھ دیر

منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر کتاب بند کر کے اُٹھ کھڑے ہوتے۔ ان کی والدہ ان سے اکثر کہا کرتی تھیں کہ "بیٹا اگر جینا ہے تو کچھ ہو کر جیو ورنہ بہتر یہی ہے کہ مر جاؤ۔"

پالکی کا واقعہ

ایک دن امجد کے مکان کے سامنے سے پالکی میں کوئی امیر جا رہے تھے۔ کہاروں کے ساتھ ساتھ پالکی پکڑے ہوئے ایک آدمی بھی دوڑ رہا تھا۔ والدہ نے امجد کو بلا کر دکھایا اور کہا "دیکھو اور اچھی طرح دیکھو ایک آدمی پالکی میں سوار ہے اور ایک پیدل پالکی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے۔ بتاؤ ان دونوں میں تم کو کس کی زندگی پسند ہے"۔ امجد نے کہا "پالکی سوار کی"..... کہا ایسی زندگی تو بغیر علم کے کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی اگر نہ پڑھو گے تو تم کو بھی دوسرے آدمی کی طرح پالکی کے ساتھ ساتھ دوڑنا پڑے گا۔ اب جو صورت چاہو اختیار کرو اس کا امجد کے دل پر بہت اثر ہوا اور انھوں نے آئندہ کھیلنے سے توبہ کر کے پڑھنے لکھنے کا عہد کر لیا۔

تعلیم و تربیت

امجد نے تربیت ماں سے اور تعلیم مشرقی علوم کے اساتذہ سے حاصل کی۔ ابتدا ہی سے ذہین تھے اور حافظہ بھی تیز تھا۔ اس لیے جو کچھ پڑھتے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتا۔ چونکہ امجد کی والدہ بھی ان کے والد کی طرح مذہبی تھیں اس لیے امجد کی تعلیم و تربیت اسلامی طرز پر شروع ہوئی۔ گھر پر ابتدائی تعلیم کے بعد امجد حیدرآباد دکن کی قدیم اسلامی درسگاہ جامعہ نظامیہ میں شریک کرا دیئے گئے، جہاں انھوں

نے چھ سال تک تعلیم پائی اس کے بعد ان کی باقاعدہ تعلیم نہیں ہوئی۔ خانگی طور پر تعلیمی سلسلہ برابر جاری رہا اور انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔

عربی زبان کا ایک بہت مشہور مقولہ ہے کہ "شاعر کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہوتا" مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر کا وجدان شعری اس کے ماحول، مطالعہ و اساتذہ کے رجحانات و خیالات سے بھی اسی قدر متاثر ہوتا ہے چنانچہ امجد کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے جامعہ نظامیہ میں مولوی سعید الدین سہارنپوری۔ مولوی عبد الوہاب بہاری جیسے یگانہ روزگار اساتذہ ملے۔ اور پھر علامہ سناد الملک شوستری اور علامہ سید نادر اللہ سے تلمذ اور استفادہ کے سبب امجد میں اعلیٰ کردار کی تشکیل۔ علمی و ادبی ذوق اور فلسفہ سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ شعری مذاق کا پیدا ہونا قدرتی تھا۔ ان اساتذہ میں سے ایک یعنی سناد الملک آغا سید علی شوستری کو بادشاہِ وقت کے استاد ہونے کا بھی شرف حاصل تھا۔

**شادی** ۱۳۲۱ھ میں سترہ، اٹھارہ سال کی عمر میں والدہ نے شیخ میراں صاحب کی لڑکی محبوب النساء بیگم سے امجد کی شادی کر دی۔ ان کے بطن سے ایک لڑکی اعظم النساء پیدا ہوئی اور اسی تعلق سے امجد ابو الاعظم کہلائے۔

**سفر بنگلور** شادی کے دو سال بعد ۱۳۲۵ھ میں کسی خانگی وجہ سے

ماں سے بگڑ کر امجد بنگلور چلا گئے۔ بنگلور میں امجد کا قیام کنٹونمنٹ کے علاقے میں عیسائی مشن میں تھا۔ مشن اسکول میں یہ تعلیم بھی دیتے تھے اور پادریوں سے مذہبی گفتگو بھی کیا کرتے۔ یہ بات یہیں تک نہ رہی بلکہ ہر اتوار کو پادری صاحب شہر میں تبلیغ کے لیے جاتے تو امجد خود بھی ان کے ساتھ شہر جاتے اور جب پادری صاحب عیسائیت کی تبلیغ کرتے تو امجد دوسری طرف اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ اور پھر ایک ہی گاڑی میں مشن کو واپس ہوتے تھے۔ اس طرز عمل سے بنگلور کے مسلمان پریشان تھے۔ بعض امجد کو عیسائی سمجھتے تھے اور بعض مسلمان۔ اس زمانے میں امجد بنگلور میں ایک پارسی ڈاکٹر کو شاہنامہ فردوسی پڑھانے پر مامور ہوئے۔

**ملازمت** اسی پارسی ڈاکٹر کی سفارش سے امجد کو ناظم تعلیمات بنگلور نے سٹی ہائی اسکول میں (۱۵) روپے ماہوار پر مدرس مقرر کرلیا۔ لیکن تین چار ماہ بعد امجد ملازمت چھوڑ کر ماں کی یاد اور ان کے بلانے پر پھر حیدرآباد واپس آگئے۔

بنگلور سے حیدرآباد آنے کے بعد مولوی عزیز مرزا مرحوم سکریٹری حکومت حیدرآباد کی سفارش سے مدرسۂ دارالعلوم میں (۲۰) روپے ماہوار پر مدرس مقرر ہوئے اور کئی سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

**امجد کا طریقۂ تعلیم** وہ لڑکوں کو بڑی شفقت اور محبت سے پڑھاتے تھے۔ عام طریقے کے مطابق کبھی لڑکوں کو مارتے

نہ تھے۔ بلکہ سمجھا کر پڑھاتے تھے۔ اپنے اخلاق۔ طلباء کے ساتھ محبت اور بہتر طریقۂ درس و تدریس کے سبب مدرسے میں اتنا اچھا اثر پیدا کر لیا کہ طلباء آپ کی تعلیم سے بے حد متاثر ہو کر آپ کے اخلاق کے گرویدہ ہو گئے۔ پانچویں جماعت میں امجدؔ تاریخ دکن اور جغرافیہ دکن پڑھاتے تھے اور چھٹی جماعت میں "تاریخ ہند" و "جغرافیہ دنیا" ریاضی فارسی وغیرہ تمام مضامین امجد ہی پڑھایا کرتے تھے۔ چونکہ طلباء آپ کو بہت چاہتے تھے اور آپ کے طریقۂ تعلیم سے بہت خوش تھے اس لیے صدر مدرسہ سے کہہ کر ایسا انتظام کرا لیا تھا۔

امجدؔ تیز اور ذہین طلباء کو جو تعلیم سے زیادہ رغبت رکھتے تھے زیادہ پسند کرتے اور مدرسے کے اوقات کے بعد بغیر کسی معاوضے کے ریاضی پڑھاتے تھے۔

**شاگرد**

امجدؔ کے شاگردوں میں یوں تو بہت سے لوگ ہیں جو حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے لیکن قابلِ ذکر پرنسپل سجاد مرزا سابق معتمدِ تعلیمات۔ پروفیسر ڈاکٹر نظام الدین۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ سید شاہ صابر حسینی۔ حبیب مرتضیٰ بن حبیب ابوبکر بن شہاب اور نصیر الدین ہاشمی ہیں۔

امجدؔ مدرسہ دارالعلوم میں ایک عرصے تک مدرسی کے فرائض انجام دینے کے بعد دفتر صدر محاسبی سرکار عالی میں تھرڈ گریڈ پر منتقل ہوئے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے مددگار صدر محاسب کے عہدے پر پہنچے اور

(۵۵) سال کی عمر میں ۱۳۵۱ف وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

**طغیانی رُودِ موسیٰ کا المناک واقعہ** امجد کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ رُودِ موسیٰ کی طغیانی ہے حیدرآباد دکن رودِ موسیٰ کے دونوں جانب واقع ہے ۱۳۲۶ ہجری ۱۹۰۸ء میں رودِ موسیٰ میں زبردست طغیانی آئی اور شہر کے اکثر محلے تباہ و برباد ہو گئے سیلاب کا پانی ندی کے دونوں کناروں سے گزر کر شاہراہوں سے ہوتا ہوا مکانوں میں گھس آیا۔ امجد کا مکان ندی کے بالکل قریب واقع تھا جہاں اب سٹی کالج کی عمارت ہے۔ اس لیے وہ سیلاب کی زد سے نہ بچ سکا اور سارا مال و اسباب سیلاب کی نذر ہو گیا۔ صرف یہی نہیں ہوا بلکہ امجد کی پیاری ماں، عزیز بیوی اور چہیتی چار سالہ بچی "اعظم النساء" دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں کے سامنے نذرِ آب ہو گئیں۔ اور صرف امجد کی ایک ذات کئی فرلانگ موجوں کے ساتھ بہنے کے بعد اس طوفانِ بلا سے بچ گئی۔ اس حادثہ سے امجد جیسے ذکی الحس انسان کا متاثر ہونا لازمی تھا چنانچہ اس عظیم جانکاہ حادثے کو امجد نے "قیامتِ صغریٰ" والی نظم میں نہایت ہی دردناک انداز میں منظوم کیا ہے۔ طغیانی کے اس دردناک حادثے نے امجد کے قلب پر بہت اثر کیا اور کئی سال تک ان کو تجرد کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔

**دوسری شادی** طغیانی کے اس حادثے کے بعد امجد کے اُستاد مولانا نادر الدین نے امجد کے اخلاق و عادات سے متاثر ہو کر اپنی لڑکی جمال النساء کی شادی امجد سے کر دی جن کا نام امجد نے جمال سلمیٰ رکھا

رکھا۔ یہ شادی ۲۵ جمادی الثانی ۱۳۳۳ھ کو ہوئی۔ مولانا کو اپنی لڑکی سے بہت محبت تھی اس لیے انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت میں خاص طور پر توجہ کی تھی۔ ان کی ظاہری و باطنی خوبیوں کا اثر امجد کی زندگی پر بہت پڑا۔

سفرِ حج

شوال ۱۳۴۵ھ کی رات امجد حج کو جانے والے احباب کو رخصت کرنے کے لیے عبدالقیوم وکیل مرحوم کے ہمراہ حیدرآباد اسٹیشن گئے۔ پلیٹ فارم حاجیوں اور رخصت کرنے والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا لوگ ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے تھے۔ اس وقت امجد نے جانے والوں کے چہروں کو حسرت کی نگاہ سے دیکھ کر یہ قطعہ موزوں کیا۔

جاتے ہو منہ موڑ کر باطل سے تم ۔۔۔ دامنِ حق اب تمھارے ہاتھ ہے
جاؤ اطمینان سے اے حاجیو ۔۔۔ کعبے والا بھی تمھارے ساتھ ہے

چوتھے مصرعے پر پہنچ کر امجد کے دل میں گدگدی پیدا ہوئی۔ اُدھر ٹرین روانہ ہوئی اِدھر امجد جانے والوں اور حرمینِ پاک کے تصور میں گھر لوٹے۔ اور راستہ چلتے چلتے اور چار مصرعے موزوں ہو گئے۔

ہر منزلِ حجاز ہے اک منزلِ سلوک ۔۔۔ ہر شب مبارک اور ہر اک دن سعید ہے
حاجی چلا ہے راہِ خدا و رسول میں ۔۔۔ کعبے میں عید ہے تو مدینے میں دید ہے

گھر لوٹتے ہوئے دل میں حج کا خیال پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ خیال نے ایک سال کے اندر عمل کی صورت اختیار کر لی اور دوسرے سال ۱۳۴۶ھ میں امجد اپنی اہلیہ جمال سلمیٰ اور حافظ سید حسینی کے ساتھ حج کو روانہ ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی بھی اس سفرِ حج میں ساتھ تھے۔ حج سے واپسی

کے بعد ۱۳۴۷ھ میں امجد کی شریکِ حیات جمال سلمیٰ کا انتقال ہوگیا۔

**تیسری شادی** بیوی کے انتقال کا صدمہ امجد کے دل پر بہت ہوا اور ان کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگیا۔ امجد اسی رنج و غم سے چند سال تک تنہائی کی زندگی بسر کرتے رہے اور پھر پنجشنبہ ۱۱ ربیع الاول ۱۳۴۹ھ میں سید ابراہیم حسینی صاحب کی دختر قمر النساء بیگم سے عقد کیا جو اس وقت بقیدِ حیات ہیں۔

**امجد کی ڈائمنڈ جوبلی** بتاریخ ۳۱ جنوری ۱۹۵۵ء حیدرآباد کی مشہور ادبی انجمن "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کی جانب سے امجد کی چہل سالہ شاعرانہ خدمات کے اعتراف میں "جشن الماس" (ڈائمنڈ جوبلی) نہایت اہتمام سے منایا گیا۔ جو سپاسنامہ امجد کی خدمت میں پیش کیا گیا اس کو اور جواب سپاسنامہ کو یہاں لفظ بہ لفظ پیش کردینا نامناسب نہ ہوگا کیونکہ امجد اُن چند خوش نصیب شعراء میں سے ایک ہیں جن کو شہرت و مقبولیتِ عام کی سند ان کی زندگی ہی میں مل گئی۔ ایک لحاظ سے تو امجد واحد شاعر ہیں جن کا جشنِ الماس منایا گیا۔

## سپاسنامہ

حکیم الشعراء سرمدِ ثانی حضرت امجدؔ!

ہم سب آج اپنی اس خوش بختی پر نازاں ہیں کہ آپ جیسے فخرِ زمانہ اور فردِ یگانہ کے اعترافِ خدمات کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ یہ ہمارے

ملک کی خوش قسمتی ہے کہ اس میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ سے لے کر آج تک ساڑھے پانچ سو سال کے طویل عرصے میں اُردو کے اُن بلند نظر شاعروں کا سلسلہ برابر قائم ہے جو صحیح معنوں میں تلامیذ الرحمٰن ثابت ہوئے اور جنھوں نے اپنی شاعری میں تصوّف و عرفان کے مضامین کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی عوامی زندگی کی نہایت ہی کامیاب ترجمانی کی۔ میراں جی شمس العشاق۔ برہان الدین جانم۔ امین الدین اعلیٰ۔ میراں جی خدانما۔ قاضی محمود بحری۔ وجیہہ الدین وجدی۔ محمد باقر آگاہ۔ سراج۔ فیض۔ وطن۔ شائق۔ حمزہ اور توفیق اس سلسلے کے دانشور اساتذۂ سخن ہیں جنھوں نے دکن کی اُردو شاعری کی صحت مند روایات قائم کیں اور فنِ شعر کو محض غزل گوئی اور غمِ جاناں تک محدود نہیں رکھا بلکہ ایسے ایسے موضوعات پر شاعرانہ کمال دکھائے کہ آج بھی اُردو ادب کی تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان صاحبِ کمالوں کے لکھے ہوئے چکّی کے گیتوں اور بچّوں کی لوریوں سے لے کر غزل اور متصوفانہ اور مابعد الطبیعاتی طویل نظموں میں بھی عام انسانوں کے جذبات اور غمِ دوراں کی کیفیات اس خوبی سے جلوہ گر ہیں کہ جب بھی ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے ان کے زمانے کے انسان اس طرح چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں کہ ان کے دلوں کی دھڑکنیں تک سنائی دیتی ہیں۔

حضرت امجدؔ! آپ اسی چمنستانِ بے خزاں کے گُل سرسبد ہیں آپ کے کلام میں انسانی فطرت کی بوقلمونیاں۔ جبر و اقتدار کی چیرہ دستیاں

اور حقایق و معارف کی موشگافیاں اس لطافت سے جھلکتی رہتی ہیں کہ پڑھنے والا زندگی سے گریز کرنے کی بجائے ایک ایسی اونچی سطح پر پہنچ کر اس سے نبٹنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد زندگی کے نشیب و فراز اس کے لیے نشیب و فراز ہی باقی نہیں رہتے۔ اور پھر خوبی یہ ہے کہ آپ کے کلام کے مطالعے کے بعد خود اعتمادی تو پیدا ہوتی ہے لیکن وہ جارحانہ تیور نہیں ابھرنے پاتے جن کو بعض جدید شعراء کا کلام ابھارتا ہے۔

آپ ہندوستان میں عام طور پر رباعی گو شاعر مشہور ہیں اور اسی لیے آپ کو سرمدِ ثانی کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے مگر یہ آپ کی صاحب کمالی کا صرف ایک ہی رُخ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے غزلیں اور نظمیں بھی اسی رنگ میں نہایت اعلیٰ پایہ کی لکھی ہیں اور اردو نثر میں بھی آپ کی کئی پاکیزہ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں جو سب کی سب آپ کے مخصوص نظریۂ زندگی اور دلِ زندہ کی ترجمان ہیں اور اسی لطیف اسلوب میں لکھی گئی ہیں جس میں آپ کی رباعیوں کی مقبولیت کا راز پنہاں ہے۔

آپ کی ذات سے نہ صرف اردو شاعری فارسی کے ہم پلّہ بن گئی بلکہ آپ کے وطن کی عزّت و آبرو میں ایک ایسا اضافہ ہوا جس پر یہاں رہنے بسنے والی نسلیں ہمیشہ ناز کرتی رہیں گی۔ ہمارے دلوں میں آپ سے عقیدت صرف اس لیے جاگزیں نہیں ہے کہ آپ ہماری زبان کے

ایک ایسے صاحبِ کمال فنکار ہیں جن کی نظیر اس زبان میں موجود نہیں بلکہ اس لیے بھی کہ آپ کی خدمات کے باعث وطنِ عزیز کی عزت وعظمت میں مستقل اضافہ ہوا اور اس پر ہم جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

اسی فخر و مباہات کے جذبے سے مجبور ہو کر ادارۂ ادبیاتِ اردو نے جو سرزمینِ دکن کے شیدائیانِ علم و ادب کی ایک دیرینہ تنظیم ہے مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد کی تحریک پر اہلِ ملک کو دعوت دی کہ وہ آپ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنے میں ان کے ساتھ تعاون کریں اور خوشی کی بات ہے کہ بلا تفریقِ مذہب و ملت جملہ علم دوستوں نے اس تحریک میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ ہم اس قابل ہوسکے کہ آپ کو اس جلسے میں تشریف فرما ہونے کی زحمت گوارا کرنے پر راضی کرسکیں۔

ہم آپ کے شکرگزار ہیں کہ آپ نے اپنی افتادِ طبع کے خلاف اس میں شرکت فرمائی اور ہم کو سرتاپا رہینِ منت بنا لیا۔ ہم سب کی دعا ہے کہ آپ عرصۂ دراز تک صحت و عافیت کے ساتھ ہماری زبان کے ادب و شاعری میں اضافہ کرتے اور ملک کا وقار بڑھاتے رہیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

ہم ہیں آپ کے عقیدت گزار

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ۔ اور

ملک کے دیگر علم دوست اصحاب

# جوابِ سپاسنامہ

بسم اللہِ توکّلتُ علی اللہِ والحمدُ للہِ علٰی کُلِّ حال۔

میں اپنے قدردانوں۔ دوستوں۔ عزیزوں۔ محسنوں کا شکرگزار ہوں اور ان کی اس جدّت کا معترف ہوں کہ عام دستور کے خلاف میری قبر پہ پھول ڈالنے سے پہلے میری زندگی ہی میں پھولوں کے ہار گلے میں ڈال دیئے اور میری قبر پہ شاندار گنبد بنانے سے پہلے مجھ تودۂ خاک کو عالم پاک تک پہنچا دیا لیکن پھر بھی یہی کہوں گا ؎

امجد ہزار پاک ہوا پھر بھی خاک ہے
ممکن نہیں کہ فطرتِ اصلی بدل سکے

آپ بزرگوں۔ دوستوں قدردانوں نے میری حیثیت اور استحقاق سے زیادہ ذرّہ نوازی فرما کر مجھ ذرّۂ بے مقدار کو آفتاب بنا دیا۔ میں پہلے ہی آفتاب ہوں مگر کیسا آفتاب جو لبِ بام ہے اب ڈوبا یا کہ جب ڈوبا۔ اب چھپا کہ جب چھپا۔ میں بہت دنوں سے مُوتُوا قبلَ اَنْ تمُوتُوا کے تحت اپنی ایک رباعی کا مصداق بن چکا ہوں۔ وہ رباعی یہ ہے:۔

تو کان کا کچّا ہے تو بہرا ہوجا
بدبیں ہے اگر آنکھ تو اندھا ہوجا
گالی، غیبت دروغ گوئی کب تک
امجد کیوں بولتا ہے گونگا ہوجا

کانوں سے کم سنتا ہوں۔ آپریشن کے بعد آنکھوں سے کم دیکھتا ہوں لقوے کے بعد زبان سے اچھی طرح بول نہیں سکتا۔ الحمد للہ علی کل حال۔

ان اعتبارات سے بہت حد تک مرچکا ہوں صرف گرنا باقی ہے۔
دیکھئے کب وقت آتا ہے؎ دیکھئے کب آئے کس جا آئے، کس پردے میں
آئے = خستہ جاں امجدؔ کی اک مدت سے ہو کی موت ہے۔
قصہ مختصر میں اپنے محسنوں کے لیے درگاہِ باری تعالیٰ میں دعا کرتا
ہوں اور جب تک سانس لے رہا ہوں دعا کرتا رہوں گا اور پرانی زندگی
ختم ہو کر نئی زندگی ملنے کے بعد بھی یہی کہتا رہوں گا۔ رباعی

تو مجھ سے لگائے مرا ملنے والا — اپنے کو بھلائے مرا ملنے والا
مولا مرے ہر دوست کو اپنا کر لے — تجھ سے مل جائے مرا ملنے والا

آمین آمین آمین خدا حافظ۔

وَاللّٰہُ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ ط

سید احمد حسین امجدؔ حیدرآبادی

۱۳ر جنوری ۱۹۵۵ء آغا پورہ
حیدرآباد دکن

# پیام

امجدؔ کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر ہندوستان کے مختلف حصوں سے اکثر پیامات وصول ہوئے تھے جن میں سے صرف مولانا عبدالماجد دریابادی کا پیام درج ذیل کیا جاتا ہے جو انھوں نے اس موقع پر روانہ کیا تھا:-

"امجدؔ نامور و ذیشان کے باب میں ماجدِ گمنام و بے نشان کا

پچھ عرض کرنا

سورج کو چراغ ہے دکھانا

شہد کو اور کون سی مٹھاس ڈال کر میٹھا کیا جائے اور نمک میں اور کون سی نمکینی ملا کر نمکین بنایا جائے۔

وہ میرے افضل التفضیل برائے نام ہی نہیں زندگی کے ہر صیغہ میں مجھ سے افضل۔ اکمل۔ اشرف۔ اکرم ہیں۔

اللہ ان کی عمر میں کمالات میں کرامات میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائے۔

(عبدالماجد دریابادی)

# تاثرات حضرت جوش ملیح آبادی

امجد کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر جوش نے جو مقالہ "یہ ازلی بُت پرست امجد کی محبت میں گرفتار" پڑھا تھا لفظ بہ لفظ پیش کیا جاتا ہے۔

"ادب اس دنیا کے طاق کی شمع طور اور زندگی کے تاج کا کوہ نور ہے لیکن اس غیر حساس دنیا میں جس چیز کی طرف سب سے کم توجہ مبذول فرمائی جاتی ہے وہ یہی بدبخت ادب ہے اور خصوصیت کے ساتھ آج کل جب کہ پیرزن سیاست تمام انسانی عظمتوں کے موتیوں کو زندگی کے

ہر گوشے سے چُن چُن کر اپنے ہار میں گوندھ چکی ہے اور ارباب اقتدار کے کرسیوں کے طواف کے خاطر تمام انسان کاروان در کاروان چلے آرہے ہیں کسی کو اس بات کی فرصت نکالنے کا وقت نہیں مل رہا ہے کہ وہ بارگاہِ ادب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے اور ان آفاق نگار حضرات کی خلوتوں میں دوزانو ہو کر بیٹھے جو اپنے انفاس کی ترازو میں نفاق کو تولتے اور اپنی پلکوں کی لرزشوں سے کائنات کے عقدے کھولتے ہیں۔ سماعتیں ابھی تک اس قدر موٹی اور کھوٹی ہیں کہ وہ ادیبوں اور شاعروں کے دلوں کی ان دھڑکنوں کو سن نہیں سکتیں جن میں شعریت کی موسیقی جھولا جھولتی اور اپنی تانوں پر کائنات کی روح کو رقص پر مجبور کر دیتی ہے۔

سیاست کے منبر و محراب کی تقریریں بڑے شوق سے سنی جاتی ہیں حالانکہ وہ تمام تقریریں مرے ہوئے جانوروں کی ہڈیوں کی طرح سخت اور ریتے ہوئے شیشم کے برادے کے مانند خشک ہوتی ہیں لیکن ایک کان بھی ایسا نہیں ملتا جو اس پر آمادہ ہو کہ اپنے پیمانے میں شعر و موسیقی کا شہد گھولے اور اس سے اپنی بصیرت کی آنکھیں کھولے کس سے کہا جائے کہ اس کرۂ ارض پر اگر کوئی حقیقی اور پائدار عظمت پائی جا سکتی ہے تو وہ صرف عظمتِ شاعرانہ ہے اور یہ وہ عظمت ہے کہ دنیا کی تمام عظمتیں اس کے قدموں پہ سربسجود نظر آتی ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ شاعر اپنی موت کے بعد اپنی زندگی کا آغاز کیا کرتا ہے اور

"شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن"
کے سہارے اپنی درماندہ زندگی کی شام امید کے چراغ جلاتا رہتا ہے
پھر بھی اپنی زندگی کی درماندگی کے باوجود جب وہ یہ نعرہ بلند کرتا ہے کہ
گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں      کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

تو اس زمین کے تمام ذرّے اور اس آسمان کے تمام تارے اس دعوے کی تصدیق کرتے اور یہ بانگِ دہل کہتے ہیں کہ اس آواز پر جو ایمان نہیں لاتا وہ کافر ہے۔

مجھے کامل یقین ہے کہ بہت ہی کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ شاعری ایک نہایت دردناک عمل کا نام ہے اور یہ عمل اس قدر صعوبت انگیز ہے کہ اگر پہاڑوں اور آسمانوں پر اسے نازل کیا جائے تو ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ کر رہ جائے۔

تخلیق ادب و شعر کے کرب کو بیان کے سانچے میں ڈھالا نہیں جا سکتا اور اگر اسے بیان کرنے کی سعی کی جائے گی تو الفاظ سے خون ٹپکنے لگے گا۔

ہر سانس میں ہوتے ہیں دل و جاں غربال
ہر آن میں ہوتے ہیں لاکھوں مہ و سال
اس کرب کی شرح غیر ممکن ہے ندیم
جس کرب کے ساتھ صرف بنتا ہے خیال

یہ اپنے ہی خوں میں نہانے والے
یہ تابہ زباں سخن کے لانے والے
واللہ کہ ہیں چشم و چراغ آفاق
یہ فکر کو آواز بنانے والے

فکر کو آواز بنانا ہنسی کھیل نہیں یہ ملکوں کے زیر و زبر اور شمس و قمر کے مسخر کر لینے سے زیادہ کہیں زیادہ مشکل کام ہے اگر دنیا کے تمام فاتحوں، موجدوں، عالموں اور سائنسدانوں پر تخلیق شعر کا ایک لمحہ بھی طاری کر دیا جائے تو میرا دعویٰ ہے کہ وہ ایک پل کے اندر خون تھوک کر مر جائیں گے لیکن یہ صنف اس قدر ازلی بدبخت ہے کہ اس کے سمجھنے اور اس کے پرکھنے والے کہیں صدیوں میں پیدا ہوا کرتے ہیں اس لیے عظمت سخنداں کے چہرے پر ناقدری کی گرد پڑی رہتی ہے اور ؎

کیا خبر یہ ناقداں گل پھول چڑھائیں
خوبان صدف عذار موتی برسائیں
کہتا ہے میرا وطن کہ از راہ کرم
حضرت اب انتقال فرما جائیں

چنانچہ اس ناقدری اور سرد بازاری کے دور میں جب میں نے یہ سنا کہ میرے دوست حضرت امجد کی حیدر آباد میں جوبلی منائی جارہی ہے تو میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا اور ع
پس از خدمت گزر افتادیہ ما کار داں را

گنگنانے لگا میں آپ تمام حضرات کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے امجد کی جوبلی مناکر اپنے ذوق کی صحت اور اپنے ذہن کی شرافت کا کتنا بڑا ثبوت دیا ہے جس کا ذکر نا ممکنات سے ہے۔

حضرت امجد میرے پُرانے دوست ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے بھولے پن کی بناء پر ایک ایسے جادہ پر گامزن ہیں جس کے دونوں طرف بوڑھی عورتوں کی سی عقیدت رکھنے والے درویشوں کے خیمے نصب ہیں لیکن اس اختلافِ مسلک کے باوجود جب میں امجد کی رباعیاں پڑھتا اور سُنتا ہوں تو جُھوم جُھوم جاتا ہوں۔ یہ امجد کی شاعرانہ عظمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ میں بھی ان کے اشعار پر وجد کرتا ہوں۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ میں اپنے کو خدانخواستہ کوئی بڑا آدمی سمجھتا ہوں میرا مقصد اس سے یہ ہے کہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ان کے اشعار کی معنویت سے غیر متفق ہونے کے باوجود میں ان کے اشعار پر سر دُھنتا ہوں اور وہ شاعر جو منکر و مخالف کو بھی داد دینے اور قدر کرنے پر بھی مجبور کر دے کوئی معمولی شاعر نہیں ہو سکتا اختلافِ مسلک کی بناء پر میں نے اکثر یہ چاہا کہ میں ان کے اشعار سے لطف اندوز ہونا ترک کر دوں مگر جناب والا جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے مجھے اس کا اقرار ہے کہ میں اس پر قادر نہ ہو سکا اور کیسے ہو سکتا ہے

ہم نے برسات کے موسم میں جو چاہی توبہ
ابر اس زور سے گرجا کہ الٰہی توبہ

یہ میرا دعویٰ ہے کہ اچھا شاعر کبھی بُرا آدمی نہیں ہو سکتا اور میں جب امجدؔ کی طرف نظر اُٹھاتا ہوں تو اپنے دعوے کی تصدیق کو زندہ مجسم دیکھ لیتا ہوں۔ امجدؔ شاعر ہیں۔ انسان ہیں۔ نیک نفس و رقیق القلب انسان ہیں۔ رقیق القلبی ان کی خوش قسمتی بھی ہے اور بدبختی بھی خوش قسمتی اس لحاظ سے ہے۔ ع

"آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"

کے دور میں بھی وہ انسان ہیں۔ صحیح معنیٰ میں انسان ــــــ اور بدبختی اس لحاظ سے ہے کہ وہ بے چارے افسانہ افسوں میں مبتلا ہو کر وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں یہ دردناک آواز گونجا کرتی ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اس کے علاوہ امجدؔ میں ایک آن بھی ہے ایک ایسی آن کہ اُن سن و سال میں بھی ان میں معشوقیت پائی جاتی ہے اور شاید حافظؔ نے ان ہی کے لیے کہا تھا۔

بندہ طلعتِ آن باش کہ آنے دارد

یہ بندہ خاکسار اور یہ رندِ جہاں گرد چونکہ ازلی بُت پرست ہے اس لیے امجدؔ کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔



فضل العلما ڈاکٹر عبدالحق رح    حضرت امجد

آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

امجد جس ادا سے آنکھ اُٹھاتے اور جس شیرینی سے مسکراتے ہیں اس پر ہزاروں پری زادوں کو قربان کیا جا سکتا ہے اور اس وقت جب کہ وہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں حاضرین کو چیلنج دیتا ہوں کہ:-

اینست کہ دل بردہ و خوں کردہ بسے را
بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

جوش برلیتر ہوش
۳۱-۱-۱۹۵۵ء

**مدراس کا سفر**

جشن الماس کے دوسرے دن افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق صاحب رکن پبلک سروس کمیشن حکومت مدراس حضرت امجد اور بیگم امجد کو اپنے ہمراہ مدراس لے گئے۔ یہاں امجد نے مختلف جلسوں اور مشاعروں میں شرکت فرمائی۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے مدراس میں آپ کا اِن الفاظ میں تعارف فرمایا: "مجھ سے ملنے کے لیے آج تک جتنے حضرات بھی مدراس آئے مجھے اپنا بزرگ سمجھ کر آئے لیکن اس مرتبہ میرے بزرگ تشریف لائے ہیں آج میں اپنے اِن بزرگ حضرت امجد کا آپ سے تعارف کراتے ہوئے انتہائی فخر عزت اور مسرت محسوس کر رہا ہوں گو ان کی عظیم شخصیت میرے تعارف کی محتاج نہیں۔ مدراس میں قریب ایک ماہ قیام کرنے کے بعد آپ

کرنول ہوتے ہوئے حیدرآباد واپس ہوئے۔

۱۰ر جولائی ۱۹۵۸ء دو تین سال پہلے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے اپنے شاندار اسٹیشن کا افتتاحی جلسہ جوبلی ہال میں منعقد کیا اس تقریب میں صدر ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد، گورنر اور چیف منسٹر آندھرا پردیش، دیگر وزرا اور عہدہ داروں وغیرہ کے ساتھ امجد بھی مدعو تھے جہاں آپ نے صدر کی تقریر سے پہلے اپنی دو تین رباعیاں سنائیں جو ریکارڈ کر لی گئیں۔

۱۹۵۸ء میں ساہتیہ اکیڈیمی حیدرآباد کی جانب سے آپ کی شاندار خدمات کے اعتراف کے طور پر پانچسو روپے پیش کئے گئے۔

**آنکھ کا آپریشن** سال گزشتہ ڈاکٹر پھاٹک کے خانگی دواخانے میں آپ کی آنکھ کا آپریشن ہوا جو کامیاب رہا آپ لکھنے پڑھنے کے قابل ہو گئے۔ اور اکثر فرمایا کرتے کہ "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورے جسم کی قوت کھینچ کر آنکھ میں آگئی ہے"

**وفاتِ امجد** وفات سے دو تین دن پہلے آپ کو جاڑے سے بخار آیا اور سہ شنبہ کی شام تک اس میں اُتار چڑھاؤ رہا اس دوران میں نہ صرف آپ نے حسبِ معمول نماز اور قرآن کی تلاوت جاری رکھی بلکہ خاص بات یہ رہی کہ آپ شبِ چہارشنبہ رات تمام بار نیم فرماتے گئے اور دو، دو رکعت نماز پڑھتے رہے۔

چہارشنبہ کے دن طبیعت کچھ ناساز رہی سینہ میں تکلیف محسوس ہونے پر ڈاکٹر شاہ نواز صاحب کو دن کے تقریباً بارہ ۱۲ بجے بلوایا گیا

ڈاکٹر صاحب سے بعد سلام گفتگو رہی۔ ڈاکٹر صاحب کے یہ کہنے پر کہ تشویش کی کوئی بات نہیں دو تین دن میں طبیعت ٹھیک ہو جائے گی آپ نے ارشاد فرمایا "انشاء اللہ"۔

اس دوران میں آپ غالب کا یہ شعر اکثر پڑھتے رہے۔

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

آپ کے ایک معتقد مظفر حسین صاحب نے، ڈاکٹر صاحب کے ساتھ واپس ہوتے وقت مصافحہ کیا تو آپ نے ان کا ہاتھ زور سے دبا کر گلوگیر آواز میں دعائیں دیں اور خدا حافظ کہا۔ اس کے بعد جب میرے بڑے بھائی محمد تلاوت شریف صاحب نے بھی بعد قدم بوسی واپسی کی اجازت چاہی تو اجازت دی اور پُرنم آنکھوں سے ارشاد فرمایا کہ خدا حافظ ہے جاؤ، اب ہم بھی جاتے ہیں۔"

دن میں پانچ چھ بجے کے قریب حضرت امجدؔ نے اکثر ملنے والوں کو یاد کیا تو صاحبزادی نے کہا کہ شام میں آئیں گے جس پر آپ نے فرمایا کہ "ہاں اب سب آتے ہی رہیں گے۔ ہمیں کیا کرنا ہے اب سب آئیں گے بھی جائیں گے بھی"۔

رات میں آٹھ بجے کے قریب آپ نے بیگم امجد سے فرمایا کہ کیا تم بھی میرے ساتھ چلو گے بیگم امجدؔ نے ان رموز کو نہیں سمجھا اور نہ یہ

خیال گزرا کہ دو تین گھنٹہ بعد ہی امجد آپ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والے ہیں اس لیے فرمایا کہ "نہیں صاحب پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے"۔

آخری دن کے ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا اور جان گئے تھے کہ کچھ ہی دیر بعد دنیا کو چھوڑ کر اپنے رفیقِ اعلیٰ سے ملنا ہے۔

واجب ہی کو ہے دوام باقی فانی　　قیوم کو ہے قیام باقی فانی
کہنے کو زمین و آسمان سب کچھ ہے　　باقی ہے اُسی کا نام باقی فانی

رات کے نو بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب دوبارہ آئے اور انجکشن دے کر واپس ہو گئے۔ اس کے بعد پسینہ جاری ہوا تو پسینہ صاف کر کے دودھ پلا کر لٹا دیا گیا۔ کچھ دیر آنکھ لگی اور سوتے ہی سوتے میں قریب ۱۰½ بجے یکایک زور سے ہچکی لگی اور آنِ واحد میں رُوح پرواز کر گئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب لکچرار جامعہ عثمانیہ کو جو آپ کے قریب ہی رہتے ہیں بلوایا گیا، ان کی وجہ سے انتقال کی خبر شہر میں رات کے سناٹے کے باوجود آگ کی طرح پھیل گئی، صبح کے اخبارات میں سانحہ ارتحال کی خبریں شائع ہوئیں اور لوگ بلا تخصیص مذہب و ملت دار وعہدہ امجد مسکن آغا پورہ پر جمع ہونا شروع ہوئے۔ صبح ۹ بجے بعد غسلِ میت کو بغرض دیدار مردانہ حصہ میں رکھا گیا۔ دیکھنے والوں میں شاید ہی کوئی آنکھ ایسی ہو جس سے آنسو نہ بہے ہوں۔ کفن میں ملبوس

چہرہ دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آپ آرام فرما رہے ہیں، مرنے کا بہ مشکل یقین کیا جا سکتا تھا۔ چہرہ پُر نور تھا جس سے غیر معمولی اطمینان اور مسرت کے آثار نمایاں تھے۔

غرض ½ ۱۲ بجے جنازہ نامپلی ٹیک کی مسجد لے جایا گیا۔ ½ ۱ بجے بعد نمازِ ظہر دکن کی ایک بزرگ اور مقدس ترین ہستی حضرت عبداللہ شاہ صاحب نقشبندی نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ نمازِ جنازہ اور تدفین میں ہر مذہب و ملت کے علماء، مشائخین، شعراء، ادیب، اربابِ صحافت اور اہلِ قلم کے علاوہ اُردو دوستوں، تاجروں اور شہریوں کی ایک کثیر تعداد شریک تھی۔

دن کے تین بجے احاطۂ درگاہ شاہ خاموشؒ میں مشرقی صحن کے چبوترے پر راستہ کے جنوبی جانب آپ کی اہلیہ جمال سلمیٰ کے پہلو میں آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔ جہاں آپ نے اپنے لیے قبر پہلے ہی سے تیار کروا کر رکھ لی تھی۔

## اخلاق و عادات

امجدؔ صوفی منش۔ سادہ مزاج۔ بزرگ صورت۔ پاکیزہ سیرت اور بڑے متین اور خاموش انسان ہیں۔

**مزاج میں سادگی** امجدؔ نہایت سادگی پسند ہیں۔ ان کا طریقۂ زندگی بالکل سیدھا سادا ہے۔ غذا اور لباس بالکل معمولی

استعمال کرتے ہیں جس میں ازابتدا تا حال کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اہلکار درجہ سوم سے ترقی کر کے مددگار صدر محاسب بھی ہوئے لیکن ان میں نہ غرور و تکبر پیدا ہوا نہ مزاج میں کوئی فرق آیا۔ اور نہ ہی لوازمات زندگی میں کسی قسم کی تبدیلی ہوئی۔ ایک عرصے تک سیکل کی سواری کرتے رہے۔ اب عمر کے تقاضے سے اس کو ترک کر دیا ہے۔ ملازمت کے زمانے میں جبکہ دفتر صدر محاسبی دیوان کی دیوڑھی میں تھا اُس وقت آپ کا اجلاس عمارت کے بالائی حصے پر تھا۔ آپ سیکل پر دفتر پہنچتے اور سیکل اپنے ہاتھ میں لے کر بعض وقت سیکل کو مونڈھے پر رکھ کر سیڑھیاں چڑھتے تھے اگرچہ چپراسی آپ کی سیکل لینے کے لیے نیچے ہی تیار موجود رہتا تھا۔ امجد مسرف نہیں ہیں ہاں خرچ کرنے میں احتیاط سے کام لیتے ہیں زندگی میں ہمیشہ اعتدال پسند ہیں تاکہ اس میں دوعملی پیدا نہ ہو۔ منکسر المزاجی۔ طبیعت میں سادگی۔ صفائی اور عبادت ان کے خاص اوصاف ہیں اور یہ مقولہ کہ شاعر کا کلام اس کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے امجد پر پورا پورا صادق آتا ہے۔

**خودداری** امجد بہت خوددار واقع ہوئے ہیں۔ کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتے لیکن خود ہر قسم کا ایثار کرتے اور بلا تفریق مذہب و ملت دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ کس کی مدد کر رہے ہیں۔

**مہمان نوازی** امجد بڑے مہمان نواز ہیں! مہمان نوازی آپ کی خاص

صفت ہے۔ آپ سے ملنے جلنے والوں کا ایک سلسلہ جاری رہتا ہے ان میں بعض تو دنوں کیا بلکہ ہفتوں اور مہینوں آپ پاس رہتے ہیں اس سے کبھی آپ کی پیشانی پر بل نہیں پڑتے بلکہ آپ بہت خوشی اور مسرت محسوس کرتے ہیں۔

**خیر خیرات** کوئی سائل آپ کے در سے محروم نہیں جاتا۔ جب کوئی حاجت مند اور اہل غرض آپ پاس آتا تو پہلے آپ اس کو کھانا کھلاتے اگر گھر میں اس وقت کچھ نہ ہوتا تو بازار سے شیر مال وغیرہ خرید کر منگاتے اور اس کو کھلاتے یا نہیں تو کھانے کے لیے پیسے دے دیتے اور حتی المقدور ممکنہ مالی مدد بھی فرماتے تھے ہر روز قمیص یا کرتے کی جیب میں دس پانچ روپے رکھ کر شام تک خیرات کر دیتے چنانچہ زندگی کے آخری دن تک بھی آپ کا یہی معمول رہا۔

**دوستوں سے ملنا جلنا** امجد امیر و غریب اعلیٰ یا ادنیٰ جو بھی آپ پاس ملنے آئے ایک ہی طرح سے ملتے ہیں ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہی ان کا سب سے عزیز اور قریبی دوست ہے۔ وہ احباب سے ملتے ہیں تو بہ لحاظ انسان کے ملتے ہیں اور عہدے۔ مرتبے یا دولت کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ حیدر آباد کی بڑی بڑی شخصیتیں جیسے سر اکبر حیدری مرحوم۔ سر امین جنگ مرحوم۔ مہدی یار جنگ مرحوم۔ اور دیگر کئی اعلیٰ عہدہ دار جب کبھی آپ سے ملنے آتے تو آپ ہر ایک سے اسی طرح ملتے جس طرح اور لوگوں سے ملا کرتے۔ آج بھی بڑے لوگوں کی ملاقا

میں کسی قسم کا تصنع اور امتیاز روا نہیں رکھتے۔ ان کے ملنے والوں
حلقہ وسیع ہے جس میں ہر قسم اور ہر طبقہ کے لوگ شامل ہیں۔ چنانچہ
بھی ڈاکٹر بی گوپال ریڈی مرکزی وزیر مصارف و آمدنی اور گورنر اتر
پردیش جناب بھیم سین سچر صاحب و دیگر صاحبانِ اقتدار کو آپ سے
ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ اُمرا و جاگیردار۔ اعلیٰ عہدہ دار، مشائخین
ادنیٰ ملازمین اور غریب مفلوک الحال لوگ غرض سب کو آپ کی
کا فخر حاصل ہے۔ آپ اپنے کو کسی سے بھی کسی لحاظ سے اونچا یا بڑا نہیں
بلکہ اپنے کو ہر ایک سے کمتر اور چھوٹا سمجھتے ہیں۔

**نام و نمود سے پرہیز** امجدؔ نام و نمود کے ساتھ خود نمائی اور آ
کو بالکل پسند نہیں کرتے کیونکہ تکلف و
ان کی فطرت کے خلاف ہے۔ دُنیوی خواہشات اور حرص و ہوس کو
سمجھتے ہیں اس لیے دُنیوی جاہ و جلال سے کوسوں دُور رہتے ہیں

**بچّوں سے اُنس** امجدؔ کو پہلی بیوی سے ایک لڑکی اعظم النساء پیدا
ہوئی تھی جو ماں کے ساتھ طغیانی رودِ موسیٰ میں
ہو گئی۔ اس کے بعد دوسری بیویوں سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔
اس کے امجدؔ بچّوں کو بہت چاہتے اور محبت کرتے ہیں۔ بچے کسی کے
ہوں خواہ عزیز و اقارب کے یا غیروں کے۔

**ملازمین کے ساتھ برتاؤ** امجدؔ ملازمین کے ساتھ بہت اچھا
کرتے ہیں۔ جو خود کھاتے ہیں وہی

کھلاتے ہیں۔ ہمدردی سے پیش آتے ہیں اور ان کے دُکھ درد میں شریک رہتے ہیں۔

خانگی زندگی میں سب سے زیادہ اہم پہلو شریکِ حیات کے ساتھ مرد کے تعلقات ہیں۔ چونکہ عورت مرد کے سب سے زیادہ قریب اور راز دار ہوتی ہے اس لیے بیوی کے ساتھ شوہر کے تعلقات اور برتاؤ ہی سے اس کے کردار کا صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ انسانی زندگی میں خانگی اور گھریلو زندگی زیادہ اہمیت رکھتی ہے اس لیے امجدؔ کی خانگی زندگی پر بھی سرسری نظر ڈالنا نامناسب نہ ہوگا۔

## بیویوں کے ساتھ تعلقات

امجدؔ کی پہلی بیوی شادی کے صرف تین چار سال بعد طغیانی رود موسیٰ کی نظر ہو چکی تھیں اس لیے ان سے امجدؔ کے تعلقات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ البتہ امجدؔ کی دوسری بیوی جمال سلمیٰ چودہ[14] سال تک امجدؔ کے دُکھ سکھ کی شریک رہیں اس لیے امجدؔ کی آئندہ زندگی پر ان کا بہت گہرا اثر ہے چنانچہ ان کے بارے میں امجدؔ "جمال امجدؔ" میں لکھتے ہیں "شادی کے پانچ چھ برس بعد ہماری کسی خاص کوشش و محنت کے بغیر ہماری زندگی کا دور بدلنے لگا۔ وقت آ گیا اور رحمتِ الٰہی کے دروازے آہستہ آہستہ کھلنے لگے۔"

"خدا اور رسولؐ کی محبت کے آثار سلمیٰ کے اوضاع و اطوار سے ظاہر ہونے لگے ہماری حیرانی ان کی مسرت کا سبب ہمارا تعجب ان کے لطف

کا موجب ہوتا تھا کیونکہ وہ لطائف اور نکات جو کبھی اور کسی وقت خود ہمارے وہم و خیال میں بھی نہ آتے تھے ان کی زبان سے بلا تکلف ادا ہوتے تھے۔ کبھی کبھی ان ہی بحثوں اور مکالموں میں آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ اکل و شرب کی تمام لذتیں روحانی اور مذہبی مسرتوں پر قربان تھیں۔ کبھی ادھر سالن چولھے پر چڑھا ہوتا اور ادھر کوئی بحث چھڑ جاتی۔ سالن اپنے آپ پک پکا کر ٹھنڈا بھی ہو جاتا مگر یہاں سلسلہ گفتگو ختم ہی نہ ہونے پاتا۔ . . . . . . . . . خانۂ خدا کے زیر سایہ "صفا مروا کے چھوٹے اور پرفضا چمن میں ہم دونوں کی پرلطف زندگی بسر ہوتی تھی۔"

حج سے واپسی کے بعد جمال سلمیٰ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے چند سال بعد جیسا کہ اس سے قبل مذکور ہو چکا امجد نے پھر عقد کیا۔ موجودہ بیوی اوسط پڑھی لکھی صوم و صلواۃ کی سختی سے پابند۔ خوش اخلاق اور طبیعتاً بہت ملنسار ہیں۔ شوہر کی فرمانبردار اور اطاعت کیش زیادہ ہیں اس لیے دونوں کی زندگی پرمسرت اور خوش گوار ہے جو دوسروں کے لیے قابل تقلید ہے۔ بیوی شوہر کی اطاعت اور فرمانبرداری کو مقدم سمجھتی ہیں تو شوہر بیوی کی ناز برداری کرتے ہیں۔ امجد نے اپنی بیوی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق آزادی بھی دے رکھی ہے۔ بیوی کی خواہشات کی تکمیل اگر امجد اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں تو بیوی اپنے شوہر کے آرام و آسائش کا بھی ویسا ہی خیال رکھتی ہیں جس کے سبب دونوں کی زندگی بہت آسودہ اور خوش حال ہے۔

**نماز** تہجد نماز کے سختی سے پابند ہیں۔ اکثر نماز باجماعت ادا فرماتے ہیں۔ فجر کی نماز عام طور پر درگاہ پہ سقین کی مسجد میں اور کبھی کبھی مسجد ٹینک نامپلی میں ادا کرتے ہیں۔ فرض نمازوں کے علاوہ تہجد کی نماز اور نوافل بھی کثرت سے پڑھتے رہتے ہیں اور ذکر و فکر میں رات دن مشغول رہتے ہیں۔

**قرآن کی تلاوت** روزانہ قرآن کی تلاوت فرماتے ہیں اور خاص خاص باتیں حاشیہ پہ نوٹ کرتے جاتے ہیں قرآنی رموز جب آپ پر منکشف ہوتے ہیں تو خود بخود رباعی موزوں ہوجاتی ہے۔ آپ کو قرأت سے بہت لگاؤ اور دلچسپی ہے۔ اکثر وہ بڑے شوق سے قرأت سماعت فرماتے ہیں۔ خوش الحان قاریوں سے قرآن سُننے میں مسرت محسوس کرتے ہیں۔ جب کبھی اور جو کوئی قرآن کی تلاوت کرے تو آپ ہمہ تن گوش ہوکر پورے انہماک کے ساتھ سماعت فرماتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔

عام طور پہ آپ چادر اوڑھ کر چت لیٹے رہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر بہتر کوئی چیز نہیں کیونکہ اس سے آدمی بُرائیوں سے محفوظ بھی رہتا ہے اور اس کا خیال ہمیشہ اپنے خالق کی طرف لگا رہتا ہے۔

اس طرح چادر اوڑھ کر لیٹے رہنا آپ کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔

**امجد کا حلیہ**

امجد کے حلیہ کو بیان کرنے کی بجائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حلیہ کو خود ان کی زبان میں پیش کیا جائے اب امجد کے حلیہ کو خود انھیں کی زبانی سُنئے۔

"ہمارا رنگ گندمی ہے وہ گندم جس کی بدولت بابا آدم جنت سے دُنیا میں اور ہمارے بابا دُنیا سے جنت میں بھیجے گئے۔ قد دو گز سے دو انچ کم۔ سر بڑا استری کا آدھا نمبر۔ فراخ پیشانی۔ بھوں۔ آنکھ۔ کان ناک متوسط نہ بڑے نہ چھوٹے۔ رُخسار کسی قدر دبے ہوئے۔ مختصر سی ڈاڑھی۔ نور و ظلمت کا نمونہ۔ سینہ چوڑا۔ کمر سینہ سے پانچ انچ کم۔ جسم موٹا نہ دُبلا۔ مذبذب بین ذالک قوی۔ ابتدائی جوانی سے اب تک ایک حال پہ بال برابر فرق نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو پتھر ہم سے اس وقت نہیں اُٹھ سکتا تھا اب بھی اسی طرح نہیں اُٹھ سکتا۔"

**غذا**

امجد بہت سادہ غذا استعمال کرتے ہیں اور اپنے شعر "جو مل گیا سو کھا نا دانا کا نام جینا" پہ عامل ہیں۔ کسی خاص قسم کی غذا سے رغبت نہیں رکھتے جو موجود ہو کھاتے ہیں۔ کھانے کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں۔ جس وقت مل جائے اور جو مل جائے کھا لیتے ہیں۔ رمضان میں افطار و سحر میں غذا کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا جو مل جائے اسی سے افطار و سحر کرتے ہیں۔ ہندوستانی کھانوں کے سوا مغربی کھانوں سے بھی انکار نہیں کرتے۔ دسترخوان پر بھی کھاتے ہیں اور میز پہ بھی۔ سگریٹ زیادہ مرغوب ہے۔ کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ میرا ۵۰-۶۰ سال کا ساتھی ہے

**لباس** امجد کا لباس ابتدا سے آج تک نہیں بدلا۔ (۴۰، ۵۰) سال پہلے امجد جو لباس پہنتے تھے اس میں بہت کم فرق ہوا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ لباس بہت سادہ استعمال کرتے ہیں اس میں کوئی مفاخرت نہیں ہوتی۔ امجد ابتداء میں ترکی ٹوپی پہنتے تھے، حج سے واپسی کے بعد سے سپید کپڑے کی گول ٹوپی پہننے لگے ہیں۔ شیروانی اکثر سفید۔ سُرمئی۔ سیاہ اور کبھی خاکی رنگ کی پہنتے ہیں گلے میں گلوبند کی طرح کپڑا ڈال لیتے ہیں۔ قمیص یا کرتہ زیب تن کرتے ہیں۔ گھر میں عام طور پر آسمانی یا سیاہ رنگ کی لنگی (تہ بند) باندھتے ہیں۔ اور باہر جائیں تو دوہرا یا اکہرا تنگ پینچوں والا پاجامہ۔ پیر میں سلیم شاہی جوتا اور کبھی چپل بھی استعمال کرتے ہیں۔

**ادبی زندگی** امجد کی ادبی زندگی کی ابتدا ان کے طالب علمی کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔

نثر میں گلستانِ امجد در اصل گلستانِ سعدی کا بامحاورہ ترجمہ ہے اور مُسلّم الاخلاق، اخلاقِ جلالی کا۔ موخرالذکر زمانہ طالب علمی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ نثر میں امجد کی سب سے اہم تصانیف پیام امجد اور جمالِ امجد ہیں۔ پیامِ امجد میں امجد نے اپنی شاعری کے نصب العین کو متعین کر دیا ہے اور یہی ایک تصنیف ایسی ہے جو امجد کی شاعری کے موضوع کو نہایت وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جیسا کہ خود امجد نے کہا ہے "کلامِ امجد کا تمام ماخذ اور مبداء قرآنی آیات

اور احادیث سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہے"...... ہم قرآن و حدیث میں جو کچھ بھی پڑھتے ہیں ان میں سے بعض آیات اور احادیث خاص طور پر انکشاف کے در پے ہو کر (بقول سلیم مرحوم) آپ ہی آپ کسی قطعہ یا رباعی یا نظم کی صورت میں ہمارے سامنے پیش ہو جاتے ہیں اور ہم ان کو لکھ کر اپنے نام سے شائع کر دیتے ہیں" امجد کی ساری ادبی کاوشیں مذہب اور شعر کا ایک بہت خوب صورت امتزاج ہیں۔

امجد کی تصنیفات نثر کو سن واری ترتیب میں رکھا جائے تو ترتیب حسبِ ذیل ہو گی۔

۱۔ سلّم الاخلاق (اخلاقِ جلالی کا ترجمہ) یہ زمانہ طالبِ علمی کی یادگار ہے جو کمیاب ہے۔

۲۔ حجِ امجد ........ ۱۳۴۷ھ ہجری

۳۔ جمالِ امجد ........ ۱۳۴۸ھ "

۴۔ حکایاتِ امجد ........ ۱۳۵۳ھ "

۵۔ گلستانِ امجد ........ ۱۳۵۴ھ "

۶۔ میاں بیوی کی کہانی ........ ۱۳۶۰ھ "

۷۔ ایوب کی کہانی ........ ۱۳۶۷ھ "

۸۔ پیامِ امجد ........ ۱۳۶۸ھ "

# دوسرا باب

## نثر نگاری

## رُباعی

ہر نقطہ و حرف کام کر جاتا ہے
دامن گلِ معرفت سے بھر جاتا ہے
امجدؔ کا کلام کوئی خنجر تو نہیں
کیوں دل میں ہر ایک کے اُتر جاتا ہے

**جمالِ امجد** یہ امجدؔ کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے لیکن اور سوانح عمریوں کی طرح اس میں امجدؔ کی زندگی کے غیر معمولی واقعات نہیں ہیں بلکہ یہ اُن کی ذہنی تبدیلیوں کی ایک دلچسپ داستان ہے۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے ساتھ کہیں بے ساختہ ہنسا دینے والے بچپن کے کرشمے ماں کی محبت سے بھرے ہوئے افسانے۔ جوانی کی کہانیاں۔ زمانے کی نیرنگیاں رود موسیٰ کی قیامت خیز طغیانی۔ زندگی کے پیچ اور حیرت انگیز حالات۔ امجدؔ کے اپنے مشاہدات اور ان سے اخذ کئے ہوئے نتائج ہیں۔ "جن میں کہیں آہ ہے کہیں واہ ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں ابتدا سے انتہا تک ایمان کی تازگی، یقین کی زیادتی، روح کی فرحت، لازوال مسرّت کی طلعت جہاں افروز نظر آتی ہے۔ یہ امجدؔ کی شریکِ حیات جمال سلمیٰ کے نادر ملفوظات بھی ہیں جو سلوک اور تصوّف سے متعلق ہیں۔ یہ ایسی باتیں نہیں جو صرف

صوفیا اور اہلِ باطن کے لیے مفید ہوں بلکہ وہ ہر ایک کی زندگی کو سنوارنے کردار کو بنانے۔ اخلاق کو سدھارنے کے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ امجدؔ کی یہ معرکۃ الآرا تصنیف گیارہ نوشتوں پر مشتمل ہے۔ پہلے نوشتہ میں زندگی کے حالات اور آخر میں تصوف کے اسرار و سلوک کی باتیں سادہ اور عام فہم انداز میں درج ہیں۔ ہر نوشتہ اپنی طرز میں دلکش اور دل آویز ہے۔ اس کی عبارت نہایت معنی خیز اور درد انگیز ہے۔ یہ ایسی سوانح زندگی ہے جس میں تصوف اور حقائق کا خزانہ بھر دیا گیا ہے۔ یہ معرفت اور حقیقت کا مخزن ہے۔ حکمت و فلسفہ کا سرچشمہ اور حال و قال کا مرقع ہے۔ اس کتاب کو ایک مرتبہ شروع کر دینے کے بعد ختم کرنے تک چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس میں اتنی چاشنی ہے کہ ایک بار پڑھنے سے سیری نہیں ہوتی بلکہ بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے کیونکہ " اس سے ذوقِ ادب کی تشفی ہوتی ہے اور کاوشِ دل کی تسکین "جمالِ امجدؔ سے مختصر نمونے درجِ ذیل ہیں۔

**طغیانیٔ رودِ موسیٰ کے حالات**

"تقدیر میں جب تک ماں بیوی کا ساتھ دینا لکھا تھا ساتھ دے چکے۔ اب ماں دیکھ رہی ہے بیٹا بہا چلا جا رہا ہے اور جا بھی کیسا جیسے کڑی کمان سے تیر نکلتا ہے یہاں تک کے بہتے بہتے ایک درخت کے قریب پہنچ کر اس کی جھکی ہوئی ڈالی پکڑ لی اور ساتھ ہی پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ہم اس وقت اپنے ساتھیوں سے (۱۰۰) گز دور ہو گئے تھے۔ ہم نے وہیں سے چلا کر آواز دی کہ بچی کو کسی بہتے ہوئے صندوق

میں بند کر کے بہا دو۔ ممکن ہو تو میں اس طرف سے نکال لوں گا۔ اور تم بھی کسی تختے کا سہارا لے کر اپنے آپ کو دریا کی موجوں کے حوالہ کر دو۔"

حضرت کُن فیکون کے تماشے دیکھتے جائیے۔ اس کہنے کے بعد ہی والدہ کے سامنے مختلف سامانوں کے ساتھ ٹین کا ایک بڑا صندوق بھی بہتا ہوا آ گیا۔ والدہ نے اس کو پکڑ ہی لیا اور چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرح بچے کو صندوق میں بند کر کے بہا دیں مگر قسمت کی بات صندوق مقفل نکلا۔ والدہ نے مایوسی کے ساتھ پھر مجھے پکار کر کہا! "بیٹا صندوق کو قفل لگا ہے۔" پھر صندوق کو چھوڑ کر ایک بڑی شہتیر پکڑ لی اور اپنی بہو کو بھی اس کے تھام لینے کی ہدایت کر کے اپنے آپ کو دریا کے حوالے کر دیا۔ یہ ہولناک راستہ چند قدم ہی طے ہوا تھا کہ بیوی کے ہاتھ سے شہتیر نکل گئی پھر پتہ نہ چلا کہ کیا ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد والدہ بھی نہ سنبھل سکیں شہتیر سے دور جا پڑیں۔ کبھی ڈوبتی ہیں کبھی اچھلتی ہیں۔ کبھی صرف سر کے بال نظر آتے ہیں۔ کبھی زور کر کے اُبھرتی ہیں تو کچھ صورت بھی نظر آ جاتی ہے مگر پلک جھپکنے تک پھر ڈوب جاتی ہیں۔ آہ۔ آہ! ان تمام طوفانی مناظر میں یہ منظر جو کچھ تھا اس کا اندازہ ہمارے سوائے شاید ہی کوئی کر سکے۔

ہم درخت سے یہ سب حالات دیکھ رہے ہیں۔ ہر وقت قصد ہوتا ہے کہ پانی میں کود پڑوں ماں تک پہنچ جاؤں مگر دھارے کی مخالف

سمت کچھ زور نہیں چل سکتا۔

خدا کی قدرت والدہ خود بخود بہتی ہوئی ایک درخت کے قریب پہنچ گئیں جو ہم سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ ہم نے فوراً آواز دی ماں اگر درخت تک پہنچ گئی ہو تمھارے سر پر ڈالیاں جھکی ہوئی ہیں فوراً کسی ڈالی کو پکڑ لو۔

ماں نے بیٹے کی آواز سن لی اسی عالم بدحواسی میں ہاتھ بڑھا کر ایک پتلی سی ڈالی پکڑ لی اور ہماری طرف دیکھ کر کہا "ہائے بیٹا میرے دونوں چاند ڈوب گئے (یعنی بہو اور پوتی) ہم نے کہا خیر جو ہوا ہوا تم کسی طرح بچ جاؤ"

ماں نے کہا بچی کمر سے بندھی ہوئی ہے جو پانی میں لٹک گئی جس کی وجہ سے میں اوپر ابھر نہیں سکتی۔ ہماری والدہ کی یہی ایک آخری بات تھی جو ہمارے کانوں تک پہنچی۔

اب معلوم ہوا کہ والدہ نے اپنا دوپٹہ نکال کر نصف اپنی اور نصف بچی کی کمر سے باندھ لیا تھا کہ بچی کہیں ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ انھوں نے بچی کی جان بچانی چاہی۔ بچی پتھر بن کر ان کو ڈبو رہی ہے۔ اب تک دادی بچی کو نہیں چھوڑنا چاہتے تھے اب بچی ان کو نہیں چھوڑنا چاہتی ہے۔ ہماری شان بھی اس وقت تصویر لینے کے قابل تھی۔

جس درخت پر ہم چڑھے ہوئے تھے اس کو ایک لمبی ڈالی کے سہارے جو بہت اونچی چلی گئی تھی کوئی اور ٹہنی یا ڈالی نہ تھی جس سے ہماری کم

ہماری شان بھی اس وقت تصویر لینے کے قابل تھی۔

جس درخت پر ہم چڑھے ہوئے تھے اس کو ایک لمبی ڈالی کے سوائے جو بہت اونچی چلی گئی تھی کوئی اور ٹہنی یا ڈالی نہ تھی جس سے ہماری طرح کئی سانپ اور کنکھجورے لپٹے ہوئے تھے ہم اس وقت اس ڈالی پہ تکیہ کئے ہوئے اپنی ماں سے گفتگو کر رہے تھے۔

والدہ کی مذکورالصدر آخری بات سننے کے بعد وہ ڈالی جو ہماری پشت بان تھی تڑ سے ٹوٹ گئی۔ ہم اُلٹ کر پانی میں گرے۔ گر کر ابھر جو ابھر بے ساختہ ہماری زبان سے نکل گیا "اماں میں تو چلا" کاش ہماری زبان بند ہو جاتی۔ ہمارا حلق بیٹھ جاتا کیونکہ اس آواز کے ساتھ ہی گھبرا کر انھوں نے ہماری طرف دیکھا اور وہ پتلی سی ڈالی بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ماں کے دو چاندوں کی طرح ہمارا ایک چاند بھی پانی میں ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

طاقت نہیں دست و پا میں بے زور ہوں میں ۔۔۔ پامالِ زمانہ صورت مور ہوں میں
اماں! نہ سمجھنا کہ جہاں میں خوش ہوں ۔۔۔ تم ہو بے گور، زندہ در گور ہوں میں

ہم ننگِ خاندان۔ خاندان کو ڈبو کر ڈوبتے تیرتے ندی کے زبردست دھارے میں بہے چلے جا رہے تھے۔ دُور سے اس قسم V کی دو دھاریں نظر آئیں۔ سیدھے خط کی زبردست دھار بخطِ مستقیم نئے پل میں پہنچ کر بہنے والے کو ٹھیک موت کے گھاٹ اُتار رہی تھی۔ دوسری کمانی شکل کی بکھری دھار زنانہ ہسپتال کے جنوبی جانب سے ہوتی ہوئی نئے پل تک جا رہی تھی۔

ہم بہتے بہتے ان دونوں دھاروں کو دیکھتے اور سوچتے جا رہے تھے کہ اگر سیدھے خط میں جا پڑیں تو ٹھیک موت کے منہ میں پہنچ جائیں گے اگر دوسری کمانی دھارے سے گزرتے ہیں تو کچھ نہ کچھ بچنے کی اُمید ہو سکتی ہے مگر دونوں صورتیں اپنے اختیار سے باہر اور امکان سے دور تھیں۔ بارہ گھنٹے پانی میں رہتے رہتے غوطے کھاتے کھاتے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے جسم کی تمام طاقت بھی دریا بُرد ہو گئی تھی۔ اسی سوچ سوچ میں بجلی کی رفتار سے محل تقاطع تک پہنچ گئے اور وہی ہوا جس کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ یعنی سیدھی دھار میں بہتے چلے۔ موت کا یقین قطعی ہو گیا تھا اِنّا للہ کہہ کر آنکھیں بند کر لیں ایسے وقت میں خیال آیا کہ نہ معلوم ہماری لاش کدھر بہے؟ کہاں نکلے؟ کون نکالے؟ ہمارے ویسٹ کوٹ کی جیب میں پاکٹ ہے۔ پاکٹ میں کچھ روپیہ ہے۔ ہم سے مرنے والے کو روپیہ جیب میں رکھ کر مرنا بڑی شرمناک بات ہے لوگ ہماری جیب ٹٹولیں گے۔ روپیہ نکالیں گے ہماری خباثت پر نفرت کے ساتھ لعن طعن کریں گے۔

یہ خیال لفظوں میں بہت دیر میں ادا کیا گیا مگر تصور میں ایک بجلی کی چمک سے زیادہ وقفہ نہ ہوا خیال کے ساتھ ہی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پاکٹ بھی کچھ جیب سے نکلی ہوئی گویا نکلنے کو تیار ہی بیٹھی ہوئی تھی فوراً ہاتھ آ گئی۔ چھوٹی سی سیاہ پاکٹ کو ہاتھ میں لے کر اس زور اور نفرت سے پانی میں پھینکا جس طرح کوئی طاعونی چوہے کو پھینکتا ہو۔ بچانے والا پاکٹ اندازی کی آڑ میں سب کچھ کر گیا تھا ہم اپنے اسی

زور کی زد سے اس خوفناک دھار سے نکل کر دوسری کمزور دھار میں آپڑے اور اسی دھار میں کچھ دور بہنے اور زنانہ ہسپتال کے محاذ میں آنے کے بعد ہسپتال کی بیمار عورتوں نے ہمت کر کے ڈوبتے کو بچالیا۔ دریا نے بھی روپیہ لے کر جان چھوڑ دی۔ خدا کرے کہ ملک الموت جان لے کر ایمان چھوڑ دے۔ ہماری طرح صدہا جوان۔ بچے۔ بوڑھے۔ مرد۔ عورتیں کچھ ہم سے دور کچھ نزدیک بہے جا رہے تھے۔ کسی کو کسی سے سروکار نہ تھا۔ نہ معلوم ہم میں کیا سرخاب کا پر لگا تھا اور ہماری زندگی کی ایسی کیا ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ بچا لئے گئے۔ خدا اس بچنے سے بچائے۔

ہر آن مصیبت اک نئی پڑتی ہے ۔۔۔ جو پڑتی ہے جان پر کڑی پڑتی ہے
چوٹیں کھاتا ہے شیشۂ دل دن رات ۔۔۔ جیسے گھنٹے پہ موگری پڑتی ہے

بے غیرت کی بلا دور۔ ننگِ خاندان۔ خاندان کو ڈبو کر۔ عزیزوں کو کھو کر۔ ننگے دھڑنگے۔ بھیانک صورت۔ ڈراؤنا چہرہ لیے جل مانس بنے ہوئے پھر کنارے تو لگ گئے۔ بہنے والے بہہ گئے۔ ڈوبنے والے ڈوب گئے گئے اور ایسے گئے کہ لاشوں تک کا پتہ نہ چلا۔

سیلاب میں جسمِ زار گویا خس تھا ۔۔۔ غرقابِ محیطِ غم کس و ناکس تھا
اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا امجد ۔۔۔ غیرت والے کو ایک چلو بس تھا

باپ کا وہ قصہ ہوا۔ ماں کا یہ حال۔ ایسے برخوردار کی بلند اقبالی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے"؟

کس وقت دل غم زدہ مغموم نہیں ۔۔۔ رونے دھونے کی کس گھڑی دھوم نہیں

قہر مادر تو خبر بن ہی نہ سکی    لیکن گو ر پدر بھی معلوم نہیں

(جمالِ امجد صفحہ ۹۵)

**عقد کے چھ برس بعد** شادی کے پانچ چھ برس بعد کسی خاص کوشش اور محنت کے بغیر زندگی کا دور بدلنے لگا " نہ کہیں جانے کی ضرورت ہوئی نہ آنے کی ۔ وقت آگیا رحمتِ الٰہی کے دروازے آہستہ آہستہ کھلنے لگے ۔ مولانا مرحوم کی دعا کا اثر شروع ہو گیا ۔ خدا اور رسول کی محبت کے آثار سلمٰی کے اوضاع و اطوار سے ظاہر ہونے لگے ۔ سر و سینہ میں دل و دماغ کے دبے ہوئے بیج ایک طاقتور پودے کی طرح پھیلنے لگے ۔ غیر معمولی دُور بین دقیقہ رسی ۔ ذہانت ۔ ادراک غور و فکر کا ملکہ ترقی کرتا چلا ۔ دماغ کی مخفی لہروں میں بڑھتے بڑھتے سمندر کی سی طوفان خیز حیرت انگیز طاقت پیدا ہوتی چلی ۔ مُنہ سے جو بات نکلتی عجیب ہوتی ۔ جو گفتگو ہوتی حیرت خیز ہوتی ۔ وہ کہنے کے لیے تھیں اور ہم سمجھنے کے لیے تھے ۔ ہماری حیرانی ان کی مسرت کا سبب ۔ ہمارا تعجب ان کے انبساط کا موجب ہوتا تھا "

اے جانِ تو شاد ، از گرانجانیٔ ما    اے جمع دل تو از پریشانیٔ ما
ہر جلوۂ تو بہ بحر حیرت افگند    آخر غرضت چیست ز حیرانیٔ ما

اگر ہم یہ کہیں کہ کوئی بیرونی اور نئی چیز نہیں تھی بلکہ ہماری ہی قوت کا انعکاس تھا جو دوسری طرف مرتسم ہو رہا تھا اور یہ ہماری ہی تقریر کا اثر تھا جو نئے رنگ میں ظہور پذیر تھا تو صحیح نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ وہ

لطائف ونکات جو کبھی اور کسی وقت خود ہمارے وہم وخیال میں بھی نہ آئے تھے۔ ان کی زبان سے بلا تکلف ادا ہوتے تھے۔ (جمال امجد صفحہ ۱۰۹)

**خودی اور خدا** "ایک دفعہ ہم دُنیوی مصیبتوں سے گھبرا کر کہہ اُٹھے خدا ہے بھی کہ نہیں؟

ساتھ ہی سلمیٰ نے کہا "آپ بھی ہیں کہ نہیں؟"

ہم نے کہا ہم "ہیں اور ضرور ہیں۔

سلمیٰ نے کہا تو پھر خدا بھی ہے اور ضرور ہے اگر خدا نہ بھی ہو تو ہم کو اپنے اطمینان کے لیے بتوں ہی کی خُدائی تسلیم کرنی پڑے گی۔

پہلے یہ غور کر لیجیے کہ خود آپ کا وجود مستقل ہے یا غیر مستقل؟

شکل اوّل۔ اپنے بے اختیارانہ حالات اور بغیر قصد وارادہ آناً فاناً استحالات کے نظر کرتے بدیہی البطلان ہے شکل ثانی اور اپنے وجود کا غیر مستقل ہونا امر مستقل ہے پھر غیر مستقل وجود بغیر کسی مستقل وجود کے یا عرض بغیر جوہر کے یا رنگ بغیر کپڑے کے کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ آگے کی طرف بڑھو یا پیچھے کی طرف ہٹو دونوں صورتوں میں ایک ایسی ہستی پر ٹھیرنا پڑتا ہے جو اپنے قیام میں مستقل ہو۔ لولا الخالق لہلک المخلوق

بجا ہو ستارا ور مضراب نہ ہو؟ | پھیلی ہوئی چاندنی ہو مہتاب نہ ہو؟
میں ہیں نہیں ہو سکتا نہ ہو تو جب تک | ممکن ہی نہیں حباب ہو آب نہ ہو

(جمال امجد صفحہ ۲۱۶)

## جلوے کا گیت

جلوے کی گھڑی تھی اور رات کا وقت۔ دولہا دُلہن آمنے سامنے۔ سر نیوڑھائی دُلہن تو اپنے دُلہا کے بالمقابل ہو کر بھی نہ ہونے کے برابر۔ وجود میں شانِ عدم دکھاتی تھی لیکن کشیدہ قامت۔ نوعمر۔ نوخیز۔ حسین۔ مہ جبین دولہا اپنے نوشاہی لباس میں پیشانی پر افشاں، پتلے اور نازک ہونٹوں پہ پان کی دھڑی جمائے جب جلوے کی چوکی پہ جلوہ آرا ہوا ایک بجلی تھی جو چمک گئی ایک جگمگاتا آفتاب تھا جو سارے تماشائیوں کی نگاہوں کو خیرہ کر گیا۔

یہی نظارہ مجاز میں رنگِ حقیقت دیکھنے کے لیے کیا کم تھا کہ میراثنوں کے وقتیہ گیت نے تو قیامت ہی قائم کر دی۔ نظری توجہ سماعت کی طرف کھنچ گئی۔ آنکھیں بند ہو کر کان کھل گئے۔ "اِنَّا جَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا"۔

اس مجمع اضداد کے حالات سنو
کچھ معجزہ دیکھو کچھ کرامات سنو

ہے حسن کا اقتضا کہ چھپکے نہ پلک
لب کا یہ سخن ہے کہ مری بات سنو

شادی کا گیت تھا یا مسرت کا جھرنا جس کی سریلی اور شیریں آواز کانوں سے دل میں اتر اتر کر آنِ واحد میں ہزاروں ولولے پیدا کر رہی تھی۔ دوسروں کی تو خبر نہیں۔ ہماری یہ کیفیت تھی کہ روتے روتے آنکھیں خشک ہو گئی تھیں اور چیختے چیختے گلا بیٹھ گیا تھا۔ پورے گیت میں دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور پھر پھر کر آنے والا ٹکڑا:-

"ڈالو ری ماں ہار بنے کے گلے"

تو ہم کو یاد رہ گیا اور باقی گیت کی کچھ اصل کے ہم مضمون اور کچھ اپنے خیال کے موافق ہم نے تکمیل کردی۔ بالفعل تو ہم سے لفظی طور پر سُن لیجئے کبھی موقع ملے تو شاید معنوی موسیقیت کی لذت بھی مل جائے گی۔

"ڈالوری ماں ہار بنے کے گلے"

پیارا بنا مرا دُھوم گجر سے　　آیا مرے گھر اپنے گھر سے
ساون بھادوں کی آئیں گھٹائیں　　رم جھم رم جھم بادل برسے

ڈالوری ماں ہار بنے کے گلے

دُھوم مچاؤ شادی رچاؤ　　خود کو گنوا کر اس کو پاؤ
اپنے شگفتہ دل کے چمن سے　　چُن چُن کلیاں ہار بناؤ

ڈالوری ماں ہار بنے کے گلے

رستے میں آنکھوں کا فرش بچھاؤ　　گنگا جل سے پاؤں دُھلاؤ
آج سنا دو اپنا سندیسا　　آؤ سہیلیو! مل کر گاؤ

ڈالوری ماں ہار بنے کے گلے

دیکھ سمجھ کر دیکھو بھالو　　مہندی لگا کر رنگ جما لو
دل کی تمنا پوری کرلو　　لیکن پہلے دل کو سنبھالو

ڈالوری ماں ہار بنے کے گلے

امجدؔ پیا پر تن من وارو　　ہو کے تصدق صدقے اُتارو
"میں" کو دیکر "تو" کو لے لو　　جیت ہے اپنی جتنا بھی ہارو

ڈالوری ماں ہار بنے کے گلے

(حکایات امجد صفحہ ۳)

## میرے زیور

"کسی سے لینا نہ دینا میں بے چاری اپنے گھر میں اپنے معمولی لباس میں اپنی حالت میں اپنی دُھن میں بیٹھی ہوئی تھی کہ یکایک ایک بی پڑوسن۔ مان نہ مان میں تیری مہمان کی نشان سے بلا علم و اطلاع دروازہ کھلا پاکر گھر میں گھس پڑیں۔ میں ان کی اس اچانک اور زلزلہ نما آمد سے پہلے تو سہم گئی پھر کسی قدر سنبھل کر پوچھا آپ کون ہیں۔ کس لیے تشریف لائی ہیں۔ کیا کہنا چاہتی ہیں؟ مگر بی پڑوسن کے زیور میں دبے ہوئے گلے سے کوئی آواز ہی نہیں نکلی۔ بہت دیر تک سر سے پاؤں تک گھور گھور کر دیکھتی رہیں، پھر آخر بہت دیر کے بعد گنبد سے آواز نکلی بھی تو اس طرح . . . . . واہ واہ کیا کہتے ہیں تمام برادری تھو تھو رے۔ اونچی دوکان پھیکا پکوان۔ منتظم صاحب کی بیوی اور ماما کا لباس۔ سر جھاڑ۔ منہ پھاڑ۔ نہ کان میں بالا۔ نہ گلے میں مالا۔ نہ ہاتھ میں کنگن نہ پاؤں میں پازیب۔ سہاگن ہے کہ بیوہ، بیوی ہے کہ باندی؟ افسوس کس شوق سے آئی۔ کس مایوسی سے جا رہی ہوں۔"

"میں نے کہا ابھی آپ جائیے نہیں۔ جس طرح آئی ہیں مہربانی سے تھوڑی دیر تشریف رکھئے۔ میرے ہاں بہت سے قیمتی زیور ہیں مگر آپ کے زیوروں کی طرح نمائشی اور وزنی نہیں ہیں۔ میں ان کو اٹھائے اٹھائے نہیں پھرتی ہوں بلکہ وہ مجھے سنبھالے رہتے ہیں۔ لیجئے ملاحظہ کیجئے۔

دیکھیے میرے زیوروں کو دیکھو

ہے مری مستی و پان، خموشی   ہے میرا لباس، چشم پوشی

ہے گوہر گوش، حق نیوشی　　دیکھو مرے زیوروں کو دیکھو

---

سرتاج ہے میرا، میرا شوہر　　زیور نہیں کوئی اُس سے بڑھ کر
ہے سجدے کا داغ میرا جھومر　　دیکھو مرے زیوروں کو دیکھو

---

مصروف بہ کاروبار رہنا　　ہاتھوں کا میرے یہی ہے گہنا
کچھ آیا سمجھ میں میرا کہنا　　دیکھو مرے زیوروں کو دیکھو

---

چلنا ہر وقت راہ سیدھی　　پازیب ہے میری کیسی اچھی
کیا ہو گی بتاؤ قیمت اس کی　　دیکھو مرے زیوروں کو دیکھو

---

دل کی حرکت سُنو تو اک بار　　سو زیوروں کی ہے اس میں جھنکار
ہر تارِ نفس ہے میرا زنّار　　دیکھو مرے زیوروں کو دیکھو

---

گردن سے قریں ہے حقِ تعالیٰ　　اللہ رے میرے گلے کی مالا
کون اس کی ہے قدر کرنے والا　　دیکھو مرے زیوروں کو دیکھو

---

(حکایاتِ امجد صفحہ ۱۴)

## ایک کے ہو کر دیکھو

"ہمارے ایک دوست قبروں پہ بہت گرتے ہیں اور پیروں سے بہت ڈرتے ہیں۔ ایک دن ہم نے ان سے اس کا سبب پوچھا۔ بہت ہی انکار کے بعد بالآخر یہ اقرار کیا کہ قبور سے ہم کو نقصان ہوتا ہے اور پیروں کی ناراضی سے دین و ایمان کا نقصان ہے اس لیے قبروں پر گرتا ہوں اور پیروں سے ڈرتا ہوں۔

ہم نے کہا کہ نفع و نقصان تو دنیا کے ہر ذرّے ذرّے سے متعلق ہے۔ آگ، سردی سے بچاتی بھی ہے اور جلاتی بھی ہے۔

پانی پیاس بھی بجھاتا ہے اور غرق کر کے تحت الثریٰ تک بھی پہنچاتا ہے۔ ہوا، روح کو راحت بھی بخشتی ہے اور منہ بھی جھلس دیتی ہے۔

مٹی گھر بن کر جسم و جان کی حفاظت کرتی ہے اور سر پر گر کر زندہ درگور بھی کر دیتی ہے۔

"وقس علیہا البواقی"

غرض نفع و نقصان۔ سود و زیان۔ قبروں اور پیروں ہی تک محدود نہیں بلکہ مادّی کائنات کا ذرّہ ذرّہ مفید اور مضر دونوں پہلو برابر برابر رکھتا ہے۔

پھر ساری کائنات کی پوجا کیوں نہ کی جائے اور کیوں ہر ایک کے آگے سر نیاز خم نہ کیا جائے۔ اسلام کا جو ہر تجزو مباہات توحید اور صرف توحید ہے یعنی احد پرستی۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ اور دوسرے باقی ارکان اسی کے مفرعات ہیں۔ توحید اصل جذبہ ہے اور دوسرے ارکان

مظہرِ جذبات ہیں۔" (حکایات امجد صفحہ ۴۶)

**حج امجد** یہ امجدؔ کا سفر نامۂ حج ہے جو سفر کے دلچسپ حالات و دلفریب مناظر کے دلکش واقعات پر مشتمل ہے حسب موقع پر لطف قطعات و رباعیات اور پُر تاثیر نظموں کے ساتھ اپنے رنگ کا نیا سفر نامہ ہے جو دیگر سفر ناموں سے بالکل الگ ہے۔ اس میں امجدؔ نے اپنے ان احساسات اور جذبات کو ظاہر کیا ہے جو دربارِ خداوندی اور دربارِ رسولؐ میں پہنچنے کے بعد ان کے دل و دماغ پر مرتسم ہوئے۔ حج و زیارت کے حالات اور حجازی تاثرات و کیفیات کو نہایت دلپذیر انداز میں لکھا گیا ہے اور وہاں کے لوگوں کی طرز زندگی و طرزِ معاشرت۔ وہاں کے مناظر اور ہر مقام کی کیفیت کو اس خوبی سے قلمبند کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ وہیں ہے اور یہ حالات اس پر گزر رہے ہیں غرض یہ حج کے حالات اور دلکش مناظر کا دلچسپ مرقع ہے جس کے پڑھنے سے خاص لطف پیدا ہوتا ہے۔ رسالۂ معارف اعظم گڈھ کی رائے کے مطابق "یہ کتاب حج و زیارت و حجازی تاثرات کا دل پسند مرقع ہے۔ یہ کتاب حاجیوں کی محنت ٹھکانے لگاتی اور غیر حاجیوں کی آتشِ شوق بھڑکاتی ہے۔" ذیل کی رباعی قابلِ ملاحظہ ہے جو خاص کعبہ میں بوقتِ طواف کہی گئی ہے۔

رستہ تیرا سر سے طے کیا ہے ہم نے
سب کچھ تری رہ میں دے دیا ہے ہم نے
مل لیں گے کبھی تجھ سے بھی انشاءاللہ
گھر تو تیرا دیکھ ہی لیا ہے ہم نے

حج امجد سے نثر کے نمونے:-

ورود بہ مکہ | "اس مکہ معظمہ میں جہاں سے آفتاب اسلام طلوع ہوا، اس مکہ معظمہ میں جہاں کائنات کی معظم ترین ہستی (صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہوئی، وہ مکہ معظمہ جس کو قرآن نے "ام القریٰ" اور "بلد الامین" سے یاد کیا۔

حرم کعبہ میں داخل ہونے کا شوق دل کو بے چین کر رہا تھا جھٹ پٹ سامان مدرسہ فخریہ میں رکھ کر دلیل المطوف کے ساتھ حرم کعبہ میں قدم رکھا۔ ذرہ ذرہ سے اللہ اکبر اللہ اکبر کی آواز آ رہی تھی۔ اطراف گھرے ہوئے پہاڑ کی ہر چوٹی سے جل جلالہٗ کی صدا بلند تھی۔

رات کا وقت، سیاہ کعبہ۔ دو چار ٹمٹماتے ہوئے چراغوں میں کیا نظر آ سکتا تھا۔ ہر طرف گھبرا گھبرا کر دیکھنے لگے۔ ساتھ ہی کسی نے اشارہ کر کے کہا:-

جو پاک ہے جسم اور مکاں سے لو دیکھ لو یہ اُسی کا گھر ہے
یہ قصر سیاہ غلاف والا اسلام کا نقطۂ نظر ہے

دل سے تکبیر کی صدا اللہ اکبر اللہ اکبر شدت کے ساتھ بلند ہو رہی تھی ہر آنے والے کی دعا اَللّٰھُمَّ زِدْ ھٰذَا الْبَیْتَ الشَّرِیْفَ تَشْرِیْفًا وَمَھَابَۃً کا اثر دل و دماغ کو مرعوب کر رہا تھا اللہ اکبر اللہ اکبر یہی وہ مکان ہے جس کی طرف عالم کے مسلمان رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ اللہ اکبر اللہ اکبر یہی وہ نقطہ ہے جو عامۃ المسلمین کی عبادت کا مرکز قرار پایا ہے۔ اللہ اکبر

اللہ اکبر یہی مکان عبادت کا وہ پہلا گھر ہے جس کو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ علیٰ نبینا و علیہما السلام نے مل کر بنایا تھا۔ "اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖیمُ الْقَوَاعِدَ وَ اِسْمٰعِیْلَ"

اللہ اکبر اللہ اکبر یہی وہ مکان ہے جہاں بانیانِ کعبہ (ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ) کی دعا قبول ہو کر رسولِ آخر الزماںؐ خاتم النبیین۔ حاملِ قرآن مبعوث ہو کر مخلوقِ الٰہی کو آیاتِ الٰہی سناتے۔ گمراہوں کو راہِ حق دکھاتے اَن پڑھوں کو علم و حکمت کی باتیں سکھاتے۔ ناپاکوں کو پاک کرتے تھے۔ "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ آیٰتِکَ ط"

(حج امجد صفحہ ۲۳)

**دربارِ رسالتؐ** "چونکہ اس وقت رات زیادہ گزر چکی تھی۔ ہماری آنکھوں کی طرح حرم پاک کے دروازے بھی بند ہو رہے تھے اس لیے دوسرے دن بوقتِ فجر روزِ جمعہ مزورؔ صاحب کے ہمراہ باب الرحمت سے ہوتے ہوئے مسجدِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ اَلْجُمُعَۃُ الْمُؤْمِنِیْن

جماعت کھڑی ہو چکی تھی جھٹ پٹ ہم بھی شریک ہو گئے۔ فرض کی طرح نماز ادا کر دی، مزورؔ صاحب نے کہا چلئے سلام کے لیے چلئے۔ سلام کے نام سے دم ہی نکل گیا۔ تمام جذبات سلب۔ خیالات کافور۔ کیفیاتِ ماضی و حال غائب۔ جسم میں لرزہ۔ دماغ میں جھنجھناہٹ مزورؔ صاحب ہاتھ پکڑے اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا اس طرح کھینچ رہے ہیں جیسے کوئی سپاہی کسی سنگین مجرم کو شاہی دربار میں لیے جاتا ہو۔ پاؤں من من بھر

ہوگیا۔ نہ بھاگ سکتے ہیں نہ بڑھ سکتے ہیں۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر نظر کچھ نہیں آتا۔ دِل دھک دھک کر رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (حج امجد صفحہ ۴۳)

**ایوب کی کہانی** | سنہ ۱۳۲۶ھ میں رودِ موسیٰ کی طغیانی میں امجدؔ کے پورے افرادِ خاندان ماں۔ بیوی۔ بچی اور دیگر رشتہ دار ساس۔ خسر۔ سالے اور سالیاں غرقاب ہو گئے اور گھر کی تباہی کے ساتھ ساتھ تمام مال و دولت بھی برباد ہوگیا۔ اور خود امجدؔ کی حالت اس سیلاب کی زد سے بچنے کے بعد جب حضرت ایوبؑ کے مانند ہوگئی تو حضرت ایوبؑ کے قصے کا امجدؔ کے قلب پر بہت اثر ہوا جس سے متاثر ہوکر نتیجتاً امجدؔ نے قطعات۔ رباعیات اور نثر کے دلچسپ اور سادہ انداز کے ساتھ یہ کہانی جو "رب انی مسنی الضرُّ و انت ارحم الراحمین" کی تفسیر ہے لکھی۔ یہ اس قدر پراثر اور تاثیر سے بھری ہوئی ہے کہ جو پڑھنے پر نرم دل تو کیا سنگ دلوں کو بھی رُلا دیتی ہے۔

پائی ہر چیز میں نے کھونے کے لیے | اُبھرا ہوں پھر آپ کو ڈبونے کے لیے
مری ساری خوشی یہی ہے مولا | مل جائے بس اک خیال رونے کے لیے

ایوب کی کہانی سے نثر کا نمونہ!

" انسان کی کوئی حرکت قادرِ مطلق سے چھپی نہیں۔ اس پر بھی بعض ظالم مظلوموں کے کھیت غصب کر لیتے ہیں۔ غریبوں کے گلے۔ یتیموں کے گدھے بیواؤں کے بیل بھگا لے جاتے ہیں۔ بیکسوں کو لوٹتے ہیں۔ نہتوں کو قتل کرتے ہیں۔ غریبوں کے باغوں کے میوے توڑ لے جاتے ہیں۔ بیکس مظلوم

اور ان کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھوکے پیاسے رات کو سردی میں اکڑتے اور برسات میں بھیگتے ہیں۔ آڑ کے لیے پہاڑ کی چٹانوں سے جا لپٹتے ہیں۔ ظالم، ننھے معصوم بچوں کو ماؤں کی چھاتیوں سے چھین لیتے ہیں پھر ان کو ننگا بھوکا چھوڑ دیتے ہیں۔ ظالموں کی زندگی ندی نالے کی طرح جلد جلد بہہ رہی ہے۔ دین و دنیا میں لعنت کے سوا ان کا کوئی حصہ نہیں۔ جس طرح گرمی برف کو پگھلا دیتی ہے آنے والا زمانہ ان ظالموں کو بھی یوں ہی فنا کر دے گا۔ کوئی ان پر رحم نہیں کرے گا حرام کھانے سے ان کا بڑھا ہوا گوشت پوست۔ کیڑے مزے لے لے کر کھائیں گے۔ ظالم سوکھے درخت کی طرح ایک دن جڑ پیڑ سے کاٹ دیئے جائیں گے۔"

یہ سب دو روزہ کی بدمستیاں ہیں　　اتر جائے گا سارا نشہ اک دن
یہ جتنی چلتی پھرتی ہستیاں ہیں　　فنا ہو جائیں گی اک ایک کر کے

(ایوب کی کہانی صفحہ ۳۶)

## میاں بیوی کی کہانی

یہ میاں بیوی کا قصہ ہے جو کہانی کے طور پر لکھا گیا ہے۔ میاں نہایت سخت طبیعت اور جاہل تھا۔ بیوی اس کے بالکل برعکس بہت نیک اور پرہیزگار تھی۔ خدا سے ڈرنے والی۔ شوہر کی سچی پرستار۔ لیکن شوہر کا یہ حال کہ شیطان سے زیادہ ہمیشہ بیوی پر مسلط رہتا اور اس کے ساتھ بلا وجہ طرح طرح کی بے جا سختی کرتا تھا۔ اس کہانی میں میاں بیوی کے تعلقات کا تذکرہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ جس کا اندازہ کہانی پڑھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔

شوہر کے ظلم اور بیوی کی مظلومیت کو بصورت افسانہ مکالمہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے لیکن اس میں بھی اخلاق اور تصوف کی تعلیم کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے کہ جس کے پڑھنے کے بعد ظالم سے ظالم اور سخت سے سخت شوہر بھی راہِ راست پر آسکتا ہے بشرطیکہ اس کے دل میں خوفِ خدا بھی ہو۔

اس کہانی میں میاں بیوی کی مثال پیش کر کے امجد نے بیوی کے ذریعے سے میاں کو عبدیت کا وہ درس دیا ہے کہ جو واعظوں اور خطیبوں کے پند و نصائح سے زیادہ پُر اثر اور اصلاحِ حال کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ میاں کے بے تُکے سوالات اور بیوی کے لاجواب جوابات۔ خانگی زندگی سے روحانی تعلیم کا درس اور دُنیا کے مقابل میں دین کا سبق جس ناصحانہ انداز میں دیا گیا ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔

نثر کا نمونہ درج ذیل ہے:۔

جاڑوں کا موسم تھا اور سویرے کا وقت، سردی سے ہاتھ پاؤں اینٹھے جا رہے تھے ایسے موسم اور ایسے وقت میں ایک گھر میں دو میاں بیوی اپنی اپنی چارپائی پر لحاف اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔ یکایک میاں نے لحاف سے مُنہ باہر نکال کر بیوی کو آواز دی۔ غریب بیوی گہری نیند سو رہی تھی اس لیے ایک آواز پر جواب نہ دے سکی۔

" میاں نے پھر دوسری دفعہ کڑک کر کہا کم بخت سوتی ہے کہ مر گئی ہے۔ آفتاب سر پر آپہنچا لیکن اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ نرم تو شک اور گرم لحاف

کبھی باوا کے گھر میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ یہاں آکر کس قدر پاؤں پھیلائی ہے۔ میاں کی رعد نما کڑکتی ہوئی آواز سے بیوی لحاف پھینک جھٹ پٹ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میاں کا غصہ دیکھ کر رہے سہے حواس جاتے رہے۔ یہ تو نہ کہہ سکی کہ آپ کے پاؤں دباتے دباتے رات کے دو ایک بجے سوئی ہوں اس لیئے وقت پر نہ جاگ سکی۔ صرف اس قدر کہا کہ کم بخت نیند اس قدر آگئی تھی کہ وقت پر آنکھ نہ کھل سکی۔

میاں۔ یوں کیوں نہیں کہتیں کہ تم کو شوہر اور مجھ سے لائق اور قابل کمانے والے شوہر کی کوئی پروا نہیں ہے۔ نہیں معلوم کس کا گھمنڈ ہے اور کس پر غرہ ہے۔

بیوی۔ مجھے تمھارے سوا کس پر گھمنڈ ہو سکتا ہے۔ تمھارے سوائے کس پر مغرور ہو سکتی ہوں؟

میاں۔ بالکل جھوٹ۔ اگر تم میری ہوتیں تو میرے ہر حکم کی تعمیل فوراً کرتیں۔ تم اپنی اصلیت بھول گئیں۔ غلطی میری ہے کہ میں نے تم کو اس قدر سر چڑھایا پاؤں کی جوتی تو پاؤں ہی میں رہنی چاہیئے۔

بیوی۔ میں پاؤں کی جوتی ہی سہی مگر کیا آپ نے جوتی کی جوتیاں والا مضمون نہیں پڑھا۔ اگر وہ مضمون آپ کی نگاہ سے گزر جاتا تو آپ پاؤں کی جوتی کی بھی عزت فرماتے۔

میاں۔ میں ایسے واہیات مضمون پڑھتا ہوں نہ سنتا ہوں۔

بیوی۔ مضمون کوئی ایسا بڑا نہیں ہے۔ میری خاطر سے ایک مرتبہ سن لیجئے۔

(بیوی کتب خانے کے کمرے سے ایک رسالہ اُٹھا لاتی ہے اور اپنے لائق اور قابل شوہر کو اس طرح مضمون پڑھ کر سُناتی ہے)

**جوتی کی جوتیاں**

محرم کا مہینہ تھا اور ماتم امام کی مجلسیں۔ راستہ سے گزرتے ہوئے آہ و واہ کی آواز سن کر ہم بھی ایک مجلس میں جا پہنچے۔ پاؤں سے جوتی اُتار بغل میں دبا کر آگے بڑھے۔ مجلس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ تل دھرنے کو کہیں جگہ نہ تھی۔ اس پر بھی ہم گھس پٹ کر کسی طرح اکڑوں بیٹھ گئے۔ مگر ہماری بغلی جوتی کے لیے ہماری بغل کے سوا اور کہیں جگہ نہ تھی۔ کچھ دیر تو بغل میں ہی پلی رہی پھر بغل میں درد ہونے سے نکال کر گود میں رکھ لی۔ پیٹ کو رونا بندھا تو سُنا کرتے تھے مگر پیٹ کو جوتی باندھنے کا محاورہ آج ہی ایجاد ہوا۔

جوتی اور پاؤں کی جوتی کی آغوش نشینی نے سارا لطف کرکرا کر دیا۔ مرثیہ کا کوئی مصرعہ سمجھ میں آیا ہو تو قسم لے لیجئے۔ جوتی کی اس ہم آغوشی پہ پاک اور سفید کپڑے اندر ہی اندر مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ ناک الگ ناک بھوں چڑھا رہی تھی۔ آنکھیں الگ آنکھیں نکال نکال کر دیکھ رہی تھیں۔ عرش نشیں دماغ الگ بد دماغ ہو رہا تھا۔ غرض جسم کے ہر بن مو سے غریب جوتی پر لعن طعن کی جوتیاں برس رہی تھیں۔ غریب جوتی آخر کب تک صبر کرتی۔ کہاں تک اپنی ذلت گوارا کرتی؟

زبان کی صورت تو تھی ہی۔ اب سچ مچ زبان بن گئی —— بگڑ کر کہہ اُٹھی اے بے امجد! اے مغرور انسان؟ اے جلدی حیوان! اپنا

ہم جنس چمڑے کی جوتی کو زیادہ ذلت سے نہ دیکھ۔ کیا میں اس لیے ذلیل ہوں کہ خود نجاستوں میں پڑ کر تجھ کو پاک، وصاف رکھتی ہوں۔ کیا میں اس لیے ذلیل ہوں کہ چمڑے سے بنی ہوں؟ ــــــــ تو کب سونے سے بنا ہے؟ ارے تو بھی تو سر سے پاؤں تک خالی ڈھول کی طرح چمڑے سے مڑھا ہوا ہے۔ پہلے اپنی آنکھ کا شہتیر نکال پھر دوسرے کی عیب جوئی کر۔

ارے ظالم۔ اپنے محسن کے ساتھ یہ سلوک۔ بنا محسن کشی اور کسے کہتے ہیں۔ اے مغرور انسان کیا تو شیطان نہیں ہے؟ شیطان نے تو ایک حجت بھی پیش کی تھی یعنی "خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ" لیکن یہاں تو یہ فرق بھی نہیں ہے۔

میں اور تو دونوں چمڑے ہی سے بنے ہیں۔ چمڑا ہی ہمارا ظاہر و باطن ہے۔ ارے احسان فراموش! میں تو اس قابل ہوں کہ پاؤں میں پہننے کے بعد امتناناً تو مجھے سر پر بھی رکھ لیا کرے لیکن میں اس کی خواہشمند بھی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ آئندہ کسی کو اور خصوصاً اپنے محسن کو ذلیل نہ کر۔

"کام لے مگر نام نہ دھر"

ہم جوتی کی اس دریدہ دہنی اور بیان واقعی کو خاموشی سے سنتے رہے۔ جواب کا کیا موقع تھا۔ اپنی ہار مان کر جوتی کی مدح سرائی میں یہ قطعہ قاطع الغرور پڑھتے ہوئے سر جھکائے اپنے گھر واپس ہوئے۔

نوعِ انسانی ہے سرتاپا جہانِ احتیاج　　　اشرفِ عالم کی یہ درگت؟ خدا کی شان ہے
مادی دنیا میں کس کس کا ہوں میں منت پذیر　　　میرے سر پہ پاؤں کی جوتی کا بھی احسان ہے

(میاں بیوی کی کہانی صفحہ)

**ایک یا ہر ایک** ۔۔۔۔۔ اب صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔ ہاں اس پریشانی کی جمعیت کی مافوق العقل و مقتضائے فطرت ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ :-

ایک ایسا مرکز تلاش کیا جائے جو تمام صفاتِ کمالیہ کا جامع ا[ور] ہر نفع و ضرر پر قادر ہو۔ اگرچہ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا کہنے والوں [کو] ایک تعجب خیز بات معلوم ہوگی اور ساری دنیا کے انفرادی اور شخص[ی] معبودوں کو توڑ کر صرف ایک معبود سے جوڑ دینا انوکھی بات نظر آئے گ[ی] لیکن عقل کی ادراک اور گرفت سے پرے نفس الامر میں ایک مرکز حَیُّ الْقَیُّوْم فَاطِرُ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتِ ایسا ہے جو ہر صفتِ کمالیہ کا جا[مع] اور ہر نفع و ضرر آخر میں اسی نقطۂ آخر پہ جا کر منتہی ہوتا ہے۔ آگے ک[ی] طرف بڑھو یا پیچھے کی طرف ہٹو دونوں صورتوں میں ایک ایسی ہستی ک[و] ٹھیرنا پڑتا ہے جو اپنے قیام اور وجود میں مستقل بالذات ہو۔

اب تم ہی سوچو اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ تم ہی غور کرو ہزاروں ناقص اور عاجز معبود اچھے یا ایک کامل اور غا[لب] معبود اچھا؟ فَلِذَا اقِیْلَ

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

"بیوی کی تقریر تھی یا چلتا ہوا نشتر میاں کے دل و جگر چھلنی ہوگئے

ہر فقرہ دل میں گڑ گیا۔ ہر حرف کلیجے کے پار ہو گیا۔ بے ساختہ جی بھر آیا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے لگے۔ حضرت ذوالجلال کی ہیبت نے پتا پانی کر دیا۔ اڈ بڈا کر بیوی کے قدموں پر گرا اور بھرائی ہوئی آواز سے کہنے لگا میری بیوی! میری نیکی صفات ملکہ! مجھے معاف کرو۔ جس خدا کی نافرمانی سے مجھے تم نے ڈرایا ہے اسی کا واسطہ میرے لیے دعا کرو مجھ گنہگار کو بخشوالو۔ اگرچہ لوگ زن مریدی کو معیوب خیال کرتے ہیں لیکن تم سی عورت سے ارادت میرے لیے فخر ہے۔"

بیوی نے سر قدموں سے اٹھا کر کہا تم ہزار بار اپنا سر میرے قدموں پر کیوں نہ رکھو مگر پھر میرے سرتاج ہی ہو۔ تم ہزار دفعہ میری غلامی کرو مگر پھر بھی میرے آقا ہو۔ بھلا میں تمھارا گناہ کیا معاف کر سکتی ہوں۔ مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہِ۔ بس اب صحیح زندگی کی یہی صورت ہے کہ تم میرے دل میں رہو اور خدا تمھارے دل میں رہے۔ میں تمھاری ہو کر جیوں تم خدا کے ہو کر جیو۔ (میاں بیوی کی کہانی صفحہ ۱۶)

**گلستانِ امجد** یہ گلستانِ سعدی شیرازی (نظم و نثر دونوں) کا سلیس اردو ترجمہ ہے جس میں امجد نے اپنی دلچسپ نثر میں حسبِ حال قطعات اور رباعیات کے اضافہ کے ساتھ ندرت پیدا کر دی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا فارسی گلستاں اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ اردو قالب میں آگئی ہے۔ اس طرح یہ گلستانِ سعدی گلستانِ امجد بن گئی ہے۔ جس طرح فارسی گلستانِ سعدی کا کوئی جواب نہیں اسی طرح گلستانِ امجد

بھی اردو میں لاجواب ہے۔ گلستانِ امجد کے مقدمہ میں مولانا سلیمان ندوی نے لکھا ہے۔

"کہتے ہیں کہ ہم سے پہلے دو سعدی گزرے ہیں ایک سعدیؒ شیرازی اور ایک سعدیؒ دکھنی۔ سعدیؒ دکھنی کا حال اور مقال گو بعض تذکروں میں مذکور رہے مگر ان کی شخصیت کے تاریخی شواہد کی پوری تحقیق ابھی نہیں ہوئی ہے۔ بہرحال یہ تو زمانۂ ماضی کا بیان ہے۔

زمانۂ حال نے ہمارے سامنے ایک تاریخی سعدیؒ دکھنی کو پیش کر دیا ہے جس کی شخصیت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

یہ دکھنی سعدی حکیم الشعراء امجدؔ حیدر آبادی ہیں۔" دونوں سعدیوں میں عجیب مماثلت ہے وہ بھی صوفی یہ بھی صوفی۔ وہ بھی شاعر یہ بھی شاعر۔ وہ بھی چھوٹے چھوٹے فقروں والی نثر کی پیالیوں میں قند نبات گھولنے والے اور یہ بھی۔ وہ بھی نظم و نثر کو ترکیب دے کر شراب دو آتشہ تیار کرنے والے اور یہ بھی۔ اخلاق و نصیحت کی تلخی کو شہد و شکر میں ملا کر وہ بھی پلاتے تھے اور یہ بھی پلاتے ہیں۔ مجاز کو حقیقت کا پردہ وہ بھی بناتے تھے اور یہ بھی بناتے ہیں۔ اس مماثلت نے وحدت و اتحاد کی صورت اختیار کی اور وہ گلستاں جو سعدیؒ کی تھی سعدیؒ دکنی کی بن کر نمودار ہوئی اور گلستانِ امجد اپنا نام رکھا۔ . . . . . . ترجمہ کی زبان آسان اور رواں ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے مختصر جملے۔ ٹھیٹ محاورے۔ دلکش ترکیبیں۔ موٹے موٹے لفظوں سے پرہیز۔ اس کتاب کی خاص خصوصیت ہے۔"

اس کتاب کے متعلق رسالۂ معارف اعظم گڈھ ڈسمبر ۱۹۳۶ء کی رائے ہے کہ " حکیم الشعرا حضرت امجدؔ نے جن کو خدا نے زبان کی ساحری کے ساتھ قلم کی فسوں نگاری بھی عطا کی ہے۔ گلستاں کو اس کے سارے رنگ و بو کے ساتھ ہندوستانی زبان میں ڈھال دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موتی ہیں کہ ڈھلکتے جاتے ہیں۔ قند و نبات کی ڈلیاں ہیں کہ کام و دہن کو حلاوت بخشتی ہیں۔ گلستانِ امجدؔ کے منثور ترجمہ کے بعد اس کے ہم معنی یا اس سے ملتی جلتی ہوئی اپنی نظم اس طرح کھپا دی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ حریر و پرنیاں میں موتی ٹکے ہیں "

گلستانِ امجدؔ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب اپنی خوبی۔ زبان کی شیرینی اور سادگی و سلاستِ بیان کے لحاظ سے بے نظیر اور لاجواب ہے جس کے مختصر نمونے درج ذیل ہیں :۔

" بادشاہ جس کی سنتا ہو اس کو چاہئے کہ بادشاہ سے کبھی کسی کی برائی نہ کرے۔

نصیحت ۔ بادشاہ فریدون کے محل پر لکھا ہوا تھا :۔

میرے دوست دنیا نے کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ تم ایسے سے جی لگاؤ جو ہمیشہ تمھارے ساتھ ہے (یعنی خدائے تعالیٰ) دنیا پر کبھی بھروسہ نہ کرو کیونکہ دنیا آج گہوارے میں جھلاتی ہے کل سولی پر چڑھاتی ہے۔ (گلستانِ امجدؔ صفحہ ۲۶)

حکایت :۔ بڑے بڑے سرکش اور سربلند اس طرح پیوندِ خاک ہو گئے کہ ان کا

نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔ نوشیروان کی ہم سایہ بڑھیا کو مر کھپ کر ایک زمانہ گزر گیا لیکن اس بڑھیا کے ساتھ نوشیروان کی عدل پروری کا ذکر دنیا میں آج تک باقی ہے۔" (گلستان امجد صفحہ ۲۷)

حکایت:۔ "اگر دنیا کو ٹھگنا ہے تو گدڑی بہت ضروری چیز ہے۔ ورنہ عارف تو ہر لباس میں عارف رہتا ہے۔۔۔۔

"بدمعاش کے جسم میں فقیرانہ لباس ایسا ہے جیسے گدھے پر غلافِ کعبہ" (گلستان امجد صفحہ ۷۹)

حکایت:۔

فقیر کی یہ حالت دیکھ کر کسی نے کہا اس افلاس میں کیا بیٹھے ہوئے ہو فلاں شخص کے پاس جاؤ جس کی فیاضی سارے شہر میں مشہور ہے جو سب کا دامنِ آرزو بھرتا اور کسی کو محروم واپس نہیں کرتا۔"

فقیر نے کہا دوست کیا کہہ رہے ہو۔ بھکاری بن کر کسی کے گھر جانے سے تو خاموشی کے ساتھ مر جانا اچھا ہے۔ کسی کے پاس سفارشی کاغذ کا ٹکڑا لیے گھر جانے سے تو ٹکڑے جوڑ کر پہننا ہزار درجہ بہتر ہے۔" (گلستان امجد صفحہ ۱۱۸)

حکایت:۔

"بڑھاپے میں جوانی کا رنگ کس طرح آسکتا ہے۔ بہا ہوا پانی پھر ندی میں واپس نہیں ہو سکتا۔ سوکھا ہوا کھیت سبزۂ نو کی طرح کہاں لہلہا سکتا ہے۔ افسوس جوانی جاتی رہی۔ ہائے جوانی کے ساتھ ہی اصل زندگی رخصت ہو گئی اب تو مُردوں کی طرح ایک جگہ پڑا ہوا ہوں۔"

"ایک بڑھیا نے خضاب لگا کر اپنے سپید بال کالے کر لیے تھے بیں

کہا نانی اماں بالوں کو تو تم نے خضاب سے کالا کر لیا مگر اس کبڑی پیٹھ کا کیا علاج کرو گی؟" (گلستانِ امجد صفحہ ۱۸۶)

حکایت:" ایک قطرۂ خون۔ رحم میں چالیس دن رہ کر انسانی صورت اختیار کرتا ہے۔ اگر تم چالیس برس دنیا میں رہ کر بھی کچھ نہ ہوئے تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ کوئی انسان بغیر انسانیت کے صرف گوشت پوست سے انسان نہیں ہو سکتا۔ انسانی صورتیں تو دیواروں پر بھی بنی رہتی ہیں مگر کوئی ان کو انسان نہیں کہتا کیونکہ ان میں انسانیت نہیں ہے۔ (گلستانِ امجد صفحہ ۱۹۷)

نصیحت:-
"بے عمل عالم اندھے مشعلچی کی طرح ہے کہ دوسروں کو راستہ دکھاتا ہے مگر خود کچھ نہیں دیکھتا جس نے اپنی زندگی میں کوئی کارِ خیر نہ کیا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے روپیہ دے کر کچھ نہ خریدا ہو۔" (گلستانِ امجد صفحہ ۲۱۴)

نصیحت:-
"بد شوق طالبِ علم، عاشقِ بے زر کی طرح اور سالکِ بے عمل، مرغِ بے پر کی طرح۔ عالمِ بے عمل، درختِ بے ثمر کی طرح ہے اور زاہدِ بے علم، خانۂ بے در کی طرح۔ قرآن اس لیے نازل ہوا ہے کہ اس سے اخلاقِ حمیدہ حاصل کئے جائیں نہ کہ مُردوں کے سرہانے تلاوت کی جائے۔ (گلستانِ امجد صفحہ ۲۳۲)

قول:-
"بدمعاشوں سے ملنے جلنے میں اگر انسان بدمعاش نہ بھی ہو تو کم از کم بدمعاش مشہور ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی مندر میں نماز پڑھنے ہی

کیوں نہ جائے مگر بت پرست کہلائے گا۔ نادانوں کی صحبت میں رہنے والا کبھی دانا نہیں رہ سکتا۔" (گلستان امجد صفحہ ۲۳۴)

---

**پیام امجد** اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ امجد کے کلام کا مبدء اور منبع آیات قرآنی اور احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چنانچہ پیام امجد بھی پیام ہے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا۔ اس میں کلام اللہ اور احادیث کی روشنی میں اہم اور مشکل مسائل کو آسان اور عام فہم زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ اس پیام کے لکھنے اور مرتب کرنے کا سبب ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ و حال وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی (پاکستان) ہیں۔ مسودہ دیکھ کر انھوں نے اپنے ایک دوست سے کہا تھا کہ:۔

"جس طرح سر سید علیہ الرحمہ نے حضرت حالی کے مسدس کو اپنی طرف سے بارگاہِ قدوس میں پیش کرنے کے قابل سمجھا تھا اسی طرح میں بھی پیام امجد کی تحریک اور اس کی تکمیل کو اپنی تمام عمر کا کارنامہ سمجھتا ہوں۔" ڈاکٹر صاحب کا یہ اقرار بجائے خود پیام امجد کی واضح تفسیر ہے۔ "پیام امجد سے ذیل کے نمونے پیش ہیں۔

**توحید** "ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار" بہت سے الگ الگ معبود اچھے یا سب پر غالب ایک خدا اچھا؟ ایک غالب الکل اور محیط الکل معبود کی عبادت آسان ہے یا لاکھوں

کروڑوں کی۔ ایک نہیں تو پھر ہر ایک۔

توحید کے اثبات میں یہ استفساری دلیل ایسی لاجواب اور قریب الفہم ہے جس کو ہر معمولی فہم و فراست والا بغیر کسی حجت اور دلیل کے قبول کر لیتا ہے۔ اس آیت سے ہم بھی بہت متاثر رہے ہیں۔ ناظرین بھی غور فرمالیں"۔ (پیامِ امجد صفحہ ۶۸)

**مقصودِ زندگی**

"وَمَا خلقت الجن والانس الا لیعبدون" یعنی تمام جن اور انسانوں کو ہم نے عبادت کے لیے پیدا کیا۔ فکرۃ ساعۃ خیرٌ من عبادۃ سنتین سنۃ۔ گھڑی بھر کی غور و فکر کئی سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ ماہرِ اسرارِ قدرت فرماتے ہیں رَبَّنَا اَرِنَا الْاَشْیاءَ کما ھی۔ اے رب ہم پر ہر شئی کی حقیقت واضح کر دے

اس سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ غایتِ خلقت یا مقصودِ زندگی قدرت یا اسرارِ قدرت کی دریافت اور حقایق کی تحقیق ہے۔ جس قدر اسرارِ قدرت کا عرفان ہوگا اسی قدر ایمان میں ترقی ہوگی اور جس قدر ایمان میں ترقی ہوگی عبادت پرستش۔ قدر دانی۔ شکر گزاری بڑھتی جائے گی۔

زندگی صرف پیدا ہونے کا نام نہیں ہے بلکہ پیدا ہونے کے بعد پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔ (پیامِ امجد صفحہ ۱۲۱)

**آزادی**

"رَبَّنَا لَا تکلنا علیٰ انفسنا" اے رب ہم کو ہمارے نفسوں کے حوالے مت کر۔

آج کل سب کو آزادی کی فکر ہے۔ ان سب کے مدِ نظر ہم کیوں اس فکر سے محفوظ رہیں۔ سوچنے لگے کہ ہم بھی ان تمام تمدنی۔ معاشی۔ معادی۔ خانگی۔ سرکاری۔ سماجی۔ ازدواجی وغیرہ وغیرہ بندھنوں کو توڑ کر آزاد کیوں نہ ہو جائیں۔ جو جی چاہا کیا جو جی نہ چاہا نہ کیا۔ جہاں جی چاہا چلے گئے۔ جہاں جی چاہا رہ گئے۔ اپنے جی کی سنیں گے اپنے جی کی کہیں گے۔ بہر حال جب تک جیتے رہیں گے اپنے جی کے ہو رہیں گے اور بس۔ اسی کا نام ہے آزادی اور اسی کا نام ہے فقیری میں بادشاہی لیکن جب ایک قدم اور آگے بڑھایا تو معلوم ہوا کہ:-

آزادی کو لے کے کیا کروں گا  آزادی کے غم میں گھل رہا ہوں
جب نفس کی اقتدا کروں گا  اب غیر کا حکم مانتا ہوں

(پیامِ امجد صفحہ ۱۶۷)

## خاکِ پاک

"منها خلقناکم و فیها نعیدکم و منها نخرجکم تارۃً اخریٰ" یعنی تم زمین ہی سے پیدا ہوئے ہو پھر زمین ہی میں سما جاؤ گے۔ پھر زمین ہی سے اُٹھائے جاؤ گے۔

کاخ کو بھی تم اگر مقلوب کر دو، خاک ہے  لحم، مقلوب محل ہے، اور محل ہے عین کاخ
یعنی اپنا پیکرِ لحمی سراسر خاک ہے  شاہدِ مقصود، دو پردے اُلٹ کر دیکھنا

(پیامِ امجد صفحہ ۲۴)

## امجد کی نثر نگاری کی خصوصیات

"تاریخ نثرِ اردو پر سرسری نظر ڈالی جائے

تو یہ معلوم ہوگا کہ اُردو نثر کو فروغ دینے میں دکن نے کافی حصہ لیا ہے۔ یہاں نہ صرف ادبی اور مذہبی کتابیں اُردو نثر میں لکھی گئیں بلکہ سائنٹیفک کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام بھی ہوتا رہا۔ چنانچہ علوم سائنس۔ ریاضی کیمیا طبیعات، نباتیات۔ تاریخ اور جغرافیہ کے ترجمے ہونے لگے تھے اور آج بھی یہاں کے ادیب و انشاء پرداز اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ امجدؔ نے بھی اپنی نثر نگاری سے اُردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

امجدؔ کی نثر بھی نظم کی طرح بالکل سادہ۔ صاف اور عام فہم ہوتی ہے اس میں فارسی اور عربی کے موٹے موٹے الفاظ بالکل نہیں ہوتے۔ امجدؔ کی نثر چھوٹے چھوٹے جملوں سے مرکب ہوتی ہے جس کو پڑھنے سے نظم کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ نظم کی طرح نثر میں بھی سادگی کے ساتھ جاذبیت اور مٹھاس ہوتی ہے جس کی وجہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد ختم ہونے تک کتاب ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔

امجدؔ کی نثر میں سادگی اور سلاست بیان کے ساتھ شوخی اور ظرافت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ جن کے پڑھنے سے خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔ بعض وقت ہندی اور فارسی اور عربی کے الفاظ اور جملے بھی درمیان میں مزا دے جاتے ہیں۔

اخلاق اور نصیحت آپ کی تعلیم کا محور ہے جو نظم و نثر ہر دو میں موجود ہے۔ امجدؔ کا اصل پیغام اسلام اور انسانیت کا پیغام ہے اور امجدؔ کی تعلیم

اسلامی اخلاق کی تعلیم ہے امجدؔ اخلاق اور نصیحت کی تعلیم کو جس کے گھونٹ تلخ اور کڑوے معلوم ہوتے ہیں اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ اُن کی تلخی اور کڑواہٹ شیرینی سے بدل جاتی ہے اور پڑھنے والوں کے لیے یہی چیز دلچسپی کا سبب بن جاتی ہے۔

نظم کی طرح نثر بھی حکمت و معرفت کے خزانوں سے بھری ہے۔ اس میں بھی سیرت و کردار۔ اخلاق و عادات اور فلسفہ و تصوف کے مسائل اس طرح سلیس اور صاف طور پر بیان کئے گئے ہیں کہ وہ پڑھنے والوں کے لیے گراں نہیں گزرتے۔ اور قلب پر واعظ کے وعظ اور عالم کے پند نصائح سے زیادہ اثر کرتے ہیں۔

امجدؔ نظم کی طرح نثر میں بھی منفرد ہیں۔ نثر میں بھی آپ کا طرز اور اسلوب بیان سب سے نرالا اور بالکل الگ ہے جس کے امجدؔ ہی موجد ہیں۔ اخلاق کے ساتھ ادبی نقطۂ نظر سے بھی امجدؔ کی نثر بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ اسلوب بیان کی خوبی لطفِ زبان اور طرزِ ادا کی جدت کے ساتھ بہت دلکش معلوم ہوتی ہے۔

امجدؔ نہ تو افسانہ نگار ہیں اور نہ کوئی ڈرامہ نویس۔ بلکہ تصوف اور اخلاق ہی امجدؔ کا موضوع ہے جس پر قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس سادہ و سلیس انداز میں اور ایسے دلچسپ پیرایہ میں لکھتے ہیں کہ پڑھنے سے ناول اور افسانے سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں مکالمے اس خوبی سے لکھتے ہیں کہ ڈرامہ سے زیادہ لطف ملتا ہے۔ غرض امجدؔ

اندازِ تحریر۔ نرالا پیرایہ بیان۔ سلاست و سادگی کے ساتھ ساتھ کلام میں شیرینی یہ وہ خصوصیات ہیں جو امجد کی نثر میں انفرادی شان رکھتے ہیں۔

عام طور پر ہر افسانہ نویس کے پیشِ نظر یہ مقصد ہوتا ہے کہ افسانے کے ذریعے انسانی اخلاق و کردار کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں اپنے قارئین کے سامنے پیش کرے کہ پڑھنے والوں کی تفریح طبع اور دلچسپی میں کسی قسم کی کمی نہ ہونے پائے۔ نیز ان میں یہ احساس بھی پیدا ہو کہ افسانے کا مقصد صرف کردار کو پیش کر کے دلچسپی پیدا کرنا ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے سیرت سازی اور اخلاق کی درستی کے لیے عبرت انگیزی اور سبق آموزی بھی ہے اگرچہ امجد افسانہ نویس نہیں ہیں تاہم اُن کا پیام اور مقصد انسانوں کے اخلاق و کردار کی تعمیر اور انسانی زندگی کی سدھار ہے۔ وہ انسانوں میں اچھے اخلاق پیدا کرنا چاہتے ہیں اور عمدہ اخلاق کے پیدا کرنے۔ بُرائی سے روکنے کے لیے وہ محبت۔ توحید اور نیکی کی تعلیم دیتے ہیں۔

امجد کا اندازِ تحریر بہت کچھ فارسی کے بلند پایہ ادیب سعدی سے ملتا جلتا ہے اسی لیے مولانا سلیمان ندوی نے امجد کو دکن کے سعدی کا لقب دیا ہے جو مبالغہ نہیں ہے۔

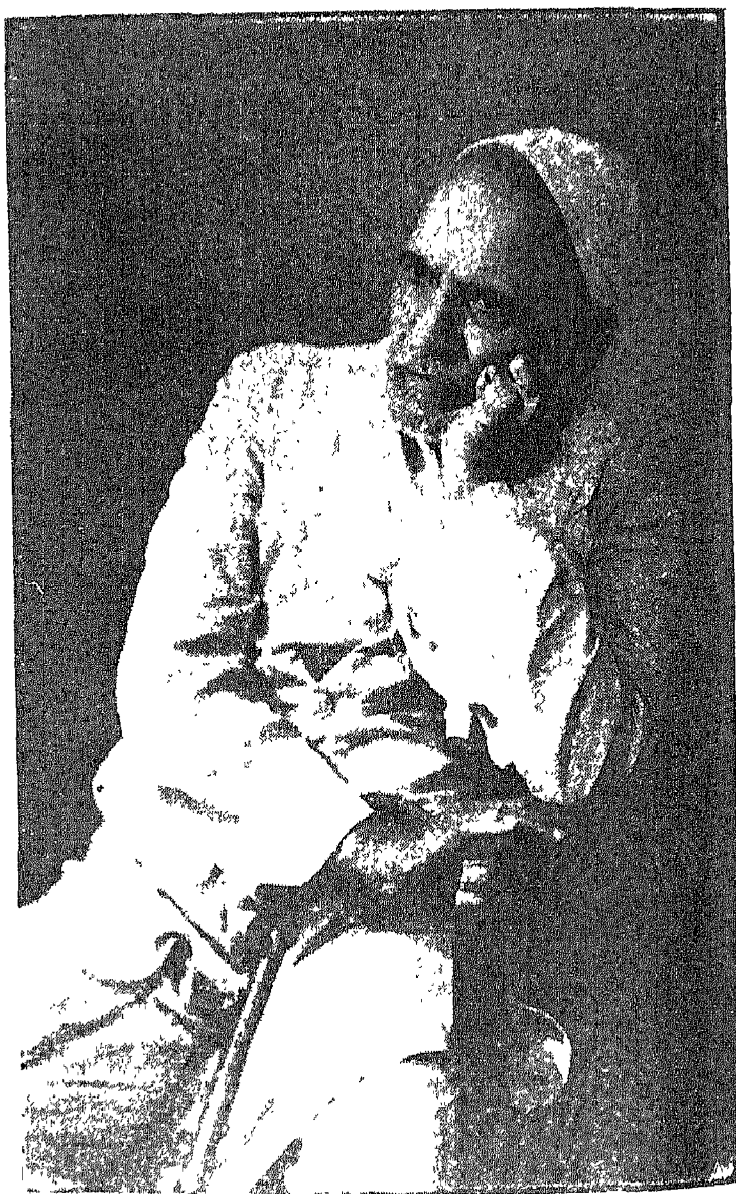
# تیسرا باب

## شاعری

## رُباعی

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے
مضمون بلند لامکاں سے لائے
ہر شعر باعتبارِ فن خوب کہا
لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے

---



## شاعری کے متعلق امجد کے خیالات

شاعری۔ موسیقی۔ مصوری۔ فنونِ لطیفہ ضرور ہیں۔ مگر نا اہلوں نے کثیف سے کثیف تر بنا دیا ہے۔ مچھ سلے بے شعور بھی شعر کہتا ہے ہر لڑکا گلیوں میں گاتا پھرتا ہے۔ مکتب کے بچے بھی تصویر بناتے ہیں وزن کے اعتبار سے شعر۔ لحن کے اعتبار سے راگ۔ آنکھ ناک کے اعتبار سے تصویر تو ضرور ہے لیکن کوئی صاحبِ فن کیا ان کو فنونِ لطیفہ میں شمار کر سکتا ہے۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند ۔۔۔ نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
نہ ہر کہ طرف کلہ کج نہاد و تند نشست ۔۔۔ کلاہ داری و آئینِ سروری داند
ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست ۔۔۔ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(حافظؔ)

شعر ہو یا راگ۔ جب تک سامع کو بے خود نہ کردے۔ بارد فطرت میں حرارت نہ پیدا کردے۔ قدیم کافر کو مسلمان نہ بنادے۔ کثیف مادے میں لطیف رُوح نہ پھونک دے۔ فنونِ لطیفہ میں شمار نہیں کئے جاسکتے ہر شعر ایک مکمل راگ یا تصویر ہوتا ہے جس طرح تصویر میں مصور کو ہر عضو اپنی اپنی جگہ خوبی اور موزونیت کے ساتھ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح شاعر کو بھی ہر لفظ اپنے مقام پہ بغیر کسی تعقید کے رکھنا پڑتا ہے۔

اس ترتیب سے قطع نظر، تناسب اور توازن بھی ضروری ہے۔ اگر ناک کی جگہ ناک تو بنائی جائے مگر اصل صورت کے اعتبار سے بڑی یا چھوٹی کردی جائے تو تعداد اجزا کے اعتبار سے تصویر مکمل تو ہوگی مگر مضحکہ خیز۔ اسی طرح موزون نظم بھی اپنی بدنظمی اور نامناسب اور ثقیل الفاظ اور دُور از فہم استعارات اور تلمیحات کی وجہ سے شعر گفتن چہ ضرور بود کا مصداق ہو جاتی ہے۔

جب تک اصل فطرت (فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا) اظہار مافی الضمیر پہ مجبور نہ کرے اور ذوقِ طبیعت متقاضی نہ ہو قافیہ ردیف کے برابر شعر کہنا نقالی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

ہماری شاعری کیا، شاعری کی نقل کرتے ہیں۔

شاعری نہ ضروریاتِ زندگی میں داخل ہے نہ واجباتِ دینی میں، اس کے پیچھے وقت خراب کرنا اور نِی کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْن کا مصداق بننا

وقت کی قدر کرنے والوں کے لیے تو مناسب نہیں ہے۔ حدیث شریف میں ہے :-

" اشعار سے پیٹ بھرنے کی بہ نسبت پیپ سے پیٹ بھرنا اچھا ہے " صاف ظاہر ہے کہ اس جگہ اشعار سے مخرب اخلاق لغو اور لاحاصل اشعار مراد ہیں۔ نظم ہو یا نثر۔ تقریر ہو یا تحریر اس کا کچھ نہ کچھ حاصل ہونا چاہیئے۔ دینی یا دنیوی خود اپنے لیے یا غیر کے لیے جس نظم و نثر میں اس امر کا لحاظ نہ ہو اور محض قافیہ پیمائی اور خامہ فرسائی کی جائے بازیچۂ اطفال ہے جس کی تعبیر مشق ابتدائی سے کی جاسکتی ہے کہ لکھا اور مٹا دیا۔

(الف) بعض شعر تو ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں محض موزونیت کے سوا کوئی اور بات ہی نہیں ہوتی جس کو لوگ واقعہ نگاری سمجھتے ہیں ؎

دندانِ تو جملہ در دہانند چشمانِ تو زیر ابروانند

(ب) بعض اشعار میں محض جدّت طرازی اور لغو مبالغے ہوتے ہیں لیکن نتیجہ کچھ نہیں۔

(ج) بعض اشعا مضمون کے اعتبار سے اچھے تو ہوتے ہیں مگر الفاظ کا لباس معانی کے جسم پر بہت تنگ اترتا ہے خواہ مخواہ معنی پیدا کرنے کے لیے جبری تاویلیں کرنی پڑتی ہیں پھر بھی تعین کے ساتھ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا صحیح مضمون کیا ہے اور شاعر کا مافی الضمیر کیا؟

(د) بعض اشعار میں محض لفظی رعب اور ظاہری نمائش ہوتی ہے اور سطوتِ الفاظ خواہ مخواہ سادہ فطرت کو مرعوب بنا دیتی ہے۔ لیکن

معنوی پہلو دیوار قہقہہ یا شاخِ زعفران کا اثر پیدا کرتا ہے۔

کہ خوانِ عنکبوت آسا سراپردہ زدہ بیروں
دروں ویرانہ و بر خوان مگس بینید بریانش

یعنی لطافتِ لفظی کے قائل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شاعری صرف موزونیت اور صحیح قوافی اور ردیف کے استعمال کا نام ہے۔ ایطا نہ ہو۔ اکفا نہ ہو۔ وزن بحر درست ہو۔ بس شعر پورا ہو گیا اور اسی کا نام لطافت ہے۔

لیکن اکثر طبقہ لطافت معنوی کی طرف مائل ہے۔ بلند معانی کی موزونیت میں لفظی اصول کی چنداں پروا نہیں کی جاتی۔ عیوب قافیہ کا خیال، خیال کا قافیہ تنگ نہیں کر سکتا۔

کہ گور کشتگاں باشد خوان اندودہ بیرونش
ولیکن اندروں باشد بہ مشک آلودہ بنجوانش
نہ چوں ماہی درونِ سو صنوبر بیروں از دم تجنش
کہ بیروں چوں صد عود و درون سوز گہر ما

اس کا تصفیہ کہ صورت اصلی جوہر ہے یا سیرت۔ صاحبانِ بصیرت سے مخفی نہیں ہے ؎

بچشم و گوش و دہان آدمی نباشد شخص
کہ ہست صورت دیوار را ہمیں تمثال

حقیقت نگار شاعر کو سطحیات کی طرف کم توجہ ہوتی ہے اور صنائع بدائعِ ظاہری اور لفظی نمائش کے حدود سے اُس کا خیال ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے۔

شاعر کو اپنے کامل جذبات کے اظہار کے لیے بعض اوقات قدیم قیود رسمی اور فرضی کو توڑ دیتا ہے۔

مست کی شان یہ ہے کہ سر و دستار سے بے خبر رہے۔ جس قدر سر و دستار کی طرف توجہ ہوگی اس کے کمال مستی میں اسی قدر فرق آجائے گا یہ بالکل صحیح ہے کہ ایک شاعر بشرطیکہ وہ حقیقی شاعر ہو اظہار جذبات میں مجذوب صفت ہوتا ہے اُس میں ایک خاص جوہر ہوتا ہے جس کو وہ خود بھی نہیں سمجھتا کیونکہ اِن معانی کی مبین کوئی اور ہی قوت ہوتی ہے جو اُسے ایسا کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ کوئی فرشتہ ہوتا ہے جو اپنی کیفیت کو ایک انوکھے راگ میں گاتا ہے اور اپنے دُکھ درد کو ایک مبہم زبان میں ادا کرتا ہے۔

وہ ہمیشہ ایسی زبان میں باتیں کرتا ہے جو نہایت عجیب و غریب اور پُر اسرار ہوتی ہیں اور اپنے مکاشفات بیان کرتا ہے کہ عام دُنیا والے اُس کو سمجھ نہیں سکتے۔ اُس کے ضمیر کی سچی آواز اور حقیقی صدا اس کو رُوح القدس کا ہمنوا بنا دیتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "(جب تک حسانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کفار کو جواب دیتے ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے فخر کرتے ہیں) خدائے پاک رُوح القدس کے ذریعے سے اُن کی تائید فرماتا ہے۔

(اس حدیث سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ شاعر جب تک حقیقت نگار اور صداقت شعار ہو خدائے پاک رُوح القدس کے ذریعے اُس کی تائید فرماتا ہے)

ہندوستان کا چھوٹے سے چھوٹا مقام بھی کوئی ایسا نہ ہوگا جہاں شاعر

نہ ہوئے ہوں یا اس وقت موجود نہ ہوں مگر چند ہی شاعر ایسے ہوئے ہیں جو صحیح معنی میں شاعر کہے جا سکتے ہیں جیسے میر تقی میر درد۔ اکبر الہ آبادی۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔ ٹیگور کی بعض مشہور تصانیف کے ترجمے اردو زبان میں میں نے پڑھے ہیں اور ان کی لذت میں گھنٹوں بلکہ دنوں مستغرق اور بے خود رہا ہوں۔

علی العموم گیتان جلی اور علی الخصوص چترا کی تاثیر اور دلاویزی حد بیان سے باہر ہے۔ قابل مترجم قابل تعریف ہے کہ دوسرے کے جذبات اور غیر زبان کے مطالب کو نہایت دلکش اور موثر طرز ادا میں ادا کیا ہے۔ سبحان اللہ وبحمدہ۔ معمار کسی نئی چیز کی تخلیق نہیں کرتا بلکہ اسی مٹی گارے کو جو پہلے سے موجود ہوتا ہے سلیقے سے چن دیتا ہے۔

صورت گر پتھر تراش کر بت نہیں بناتا بلکہ بت اس میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ مجسمہ ساز پتھر کی عارضی چادر کو اس کے چہرے سے اٹھا دیتا ہے۔

## امجد کی شاعری

امجد کی شاعری کی ابتدا ۱۳۱۸ھ سے ہوئی جب کہ ان کی عمر صرف (۱۵) سال تھی۔ پہلا شعر جو امجد نے کہا وہ یہ تھا:

نہیں غم گرچہ دشمن ہو گیا ہے آسماں اپنا
مگر یارب نہ ہو نامہرباں، وہ مہرباں اپنا

یہ نتیجہ تھا ناسخ کے دیوان کے مطالعے کا۔ بعد میں گلستاں کے مطالعے نے انھیں فارسی کی طرف بھی مائل کیا اور بلا کسی کوشش کے امجد نے ذیل

کا فارسی شعر بھی موزوں کر دیا۔

بسانِ سایۂ نصف النہار پیش پا افتد　　اگر خورشید محشر را نظر بر داغ ما افتد

امجد نے کلام کی ابتداء غزل سے کی۔ اس وقت حیدر آباد میں داغ اور میکش تھانوی کا اثر غالب تھا اس لیے امجد کی ابتدائی غزل بھی اس اثر سے خالی نہ رہ سکی۔ زبان کی سادگی۔ محاورے اور روزمرہ کا لطف اس وقت بھی ان کے کلام میں موجود تھا۔ امجد کی باقاعدہ شاعری کا آغاز تقریباً ۲۰ سال کی عمر سے (۱۳۲۲ھ) میں ان کی پہلی نظم "دنیا اور انسان" اور پہلی تضمین "ان نلت یا ریح الصبا" سے ہوا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ یہی دو کوششیں ان کی شاعری کا نقطۂ آغاز ہیں۔ طغیانی رود موسیٰ کے واقعہ تک جبکہ ان کی عمر (۲۳) برس کی تھی انھوں نے کئی غزلیں لکھیں جو طغیانی میں تلف ہو گئیں۔ امجد نے ابتدائی عمر میں جو رباعیاں لکھی تھیں وہ ۱۳۲۴ھ میں ان کے دوست ظفر یاب خاں صاحب کی تحریک پر شمسی پریس آگرہ سے شائع ہوئیں جو اب کمیاب ہیں اس کے بعد سے ان کی مختلف نظمیں اس زمانے کے مشہور رسالے مخزن۔ زمانہ۔ اور نظام المشائخ میں شائع ہوتی رہیں۔ بعد میں ان ابتدائی نظموں کا مجموعہ ریاضِ امجد کے نام سے سید عبد الغنی صاحب وارثی کی تحریک پر شائع کیا گیا۔ ریاضِ امجد کی اشاعت کے بعد ان کی نظموں کا دوسرا حصہ ریاضِ امجد حصہ دوم کے نام سے شائع ہوا جس میں ان کی شریکِ حیات جمال سلمیٰ مرحومہ کی بھی کچھ غزلیں شامل ہیں۔ اس کے بعد تصانیف کا ایک مستقل سلسلہ

ملتا ہے۔ مولوی محمد حسن صاحب بلگرامی کی تحریک پر رباعیات کی باقاعدہ اشاعت ریاضِ امجد کے بعد رباعیاتِ امجد حصہ اوّل سے ہوئی۔ پھر خرقۂ امجد۔ رباعیاتِ امجد حصہ دوم اور پھر نذرِ امجد شائع ہوئیں اور اب رباعیات حصہ سوم کی بھی اشاعت عمل میں آچکی ہے۔ امجد کی تصانیفِ نظم کو سن واری ترتیب سے رکھا جائے تو ترتیب حسبِ ذیل ہوگی:-

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ بچپن کے زمانے کی اُردو فارسی رباعیاں۔ سنِ اشاعت | | ۱۳۲۴ھ |
| ۲۔ ریاضِ امجد حصہ اوّل | " | ۱۳۳۷ھ |
| ۳۔ ریاضِ امجد حصہ دوم | " | ۱۳۴۱ھ |
| ۴۔ رباعیاتِ امجد حصہ اول | " | ۱۳۴۴ھ |
| ۵۔ خرقۂ امجد (سی پیوند) | " | ۱۳۵۲ھ |
| ۶۔ رباعیاتِ امجد حصہ دوم | " | ۱۳۵۴ھ |
| ۷۔ نذرِ امجد | " | ۱۳۵۵ھ |
| ۸۔ رباعیاتِ امجد حصہ سوم | " | ۱۳۷۵ھ |

**ریاضِ امجد حصہ اول** یہ امجد کی ابتدائی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں زیادہ تر اخلاقی اور چند متصوفانہ نظمیں ہیں اس مجموعے کی قابلِ ذکر نظموں میں "دنیا اور انسان" کے بعد "قیامتِ صغریٰ"۔ میری قمری۔ ماں اور بچی۔ ایک بیکس کا خواب جنت کی ڈاکر اور اسنو ہیلیتا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس مجموعے میں زیادہ قابلِ

وہ نظمیں ہیں جن سے امجدؔ کے خاص رنگ اور اچھوتی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ چند نظمیں ایسی ہیں جن سے امجدؔ کی عظمت آشکارا ہوتی ہے۔ فرہاد مجنوں۔ آجا۔ عاشق کا جنازہ۔ دعائے یتیم۔ اخلاقی اور متصوفانہ خیالات کے سوا شعریت کے لحاظ سے بھی بلند پایہ ہیں۔ شاعری میں سب سے اہم چیز شعریت ہے جو نازک خیالی اور لطیف احساسات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ شعر کا حاصل خود شعر ہے اس لیے شعر کہنے کے لیے پہلی شرط شعریت ہے جس کا اثر نہ صرف دل پر فوراً ہوتا ہے بلکہ اس کی صداقت کا بھی یقین ہو جاتا ہے۔ "دعائے یتیم" میں ایک کمسن لڑکی اپنے ماں باپ کی یاد میں خدا سے یوں التجا کرتی ہے:۔

دونوں جہاں کے مالک ہے لطف عام تیرا — تسکین دہ جہاں ہے مشکل میں نام تیرا
فضل و کرم جہاں پہ ہے صبح و شام تیرا — بچھڑوں سے بھی ملانا یارب ہے کام تیرا

ماں باپ سے ملا دے او آسمان والے

اپنا وسیلہ یارب گردانتی ہوں تجھ کو — ماں باپ سے زیادہ میں جانتی ہوں تجھ کو
ہوں بے شعور لیکن پہچانتی ہوں تجھ کو — ماں باپ سے زیادہ میں مانتی ہوں تجھ کو

ماں باپ سے ملا دے او آسمان والے

تم میں ہمدموں کے دم اپنا توڑتی ہوں — دنیا نے مجھ کو چھوڑا میں اس کو چھوڑتی ہوں
اب کرم پہ تیرے سر اپنا پھوڑتی ہوں — منت سے تیرے آگے اب ہاتھ جوڑتی ہوں

ماں باپ سے ملا دے او آسمان والے

(ریاض امجد حصہ اول ص ۶۲)

اس میں کہیں فطری جذبات منظوم ہیں تو کہیں دلچسپ واقعات کہیں حافظ شیرازی کے صوفیانہ کلام کی دلکش تخمیس ہے تو کہیں ہندی دوہوں کی درد بھری تضمین ہے خصوصاً طغیانی رودِ موسیٰ کے قیامت خیز منظر کو جس خوبی کے ساتھ نظم کیا گیا ہے وہ حُسنِ ادا کی اپنی آپ نظیر ہے۔ تڑپا دینے والی غزلیں۔ بارگاہِ الٰہی میں قبول ہونے والی دعا و مناجات۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت پیدا کرنے والی نعتیں قابلِ دید ہیں۔

غرض ریاضِ امجد کیا ہے۔ اعلیٰ اخلاق کا ذخیرہ ہے۔ طرزِ ادا کی دلکشی زبان کی سادگی اور سلاستِ بیان اور سب سے بڑھ کر تاثیر اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اگرچہ ہر نظم خوب سے خوب تر ہے لیکن جوشِ رحمت۔ دُنیا اور انسان۔ ماں اور بچی۔ میری قمری۔ اسنو ہیلینا۔ قیامتِ صغریٰ۔ مدینہ کی جوگن خاص طور پر قابلِ دید ہیں۔ جن سے امجد کی قادر الکلامی کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

## مُناجات بدرگاہ قاضی الحاجات

اُو میرے مالک! او عرش والے — جلوے ہیں تیرے سب سے نرالے
ہم غمزدوں کا غمخوار ہے تو — ستّار ہے تو غفّار ہے تو
تعریف تیری! میری زباں پہ! — اللہ اکبر اللہ اکبر
ہوں سر سے پا تک تصویرِ عصیاں — اعمالِ بد سے اپنے پشیماں

ہر دم ہے لب پہ یا نالہ و آہ — مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ
نخلِ معاصی دل سے قلم کر — ہم بیکسوں پہ یا رب کرم کر
کب تک پکاروں شام و سحرگاہ — اللہ! اللہ! اللہ! اللہ!
کیوں زندگی ہے برباد میری؟ — کیوں بے اثر ہے فریاد میری؟
گر تو کہے گا بدکار ہے تو — میں بھی کہوں گا غفّار ہے تو
ہے بیکسوں کو تیرا سہارا — بندہ نوازا! پروردگارا
سب نے کیا اب ہم سے کنارا — لے دے کے ہے اک تیرا سہارا
مقصد جب اپنا تجھ سے نہ پائیں — کس کو پکاریں؟ کس در پہ جائیں؟
تیرے سوا اب ہے کون میرا — بے چارا امجد بندہ ہے تیرا

(ریاضِ امجد حصہ اول ص ۳)

## مُحَمَّدَتْ (حضرت مُحَمَّد صلی اللہ علیہ وسلم)

گرد یتیمی بر تاجِ گوہر اللہ اکبر اللہ اکبر — شاہِ دو عالم بے تخت و افسر اللہ اکبر اللہ اکبر
والّیل تارے زاں زلفِ پیچاں والشمس خالِ روئے درخشاں
در جسمِ خاکی نورِ مطہر — اللہ اکبر اللہ اکبر
اے مہ لقائے شیریں ادائے بر آبِ تیغت جانم فدائے
کن ذبح بازم گو بارِ دگر — اللہ اکبر اللہ اکبر
اے در کفِ تو داروئے دلہا اے در لبِ تو اعجازِ عیسیٰ
با شوقِ دارم سر زیرِ خنجر — اللہ اکبر اللہ اکبر

آں جانِ عالم بیروں برآمد صد جانِ عالم بیروں برآمد
ہم خلق قاتل ہم بندہ پرور اللہ اکبر اللہ اکبر
آں مظہرِ حق محبوبِ خالق چوں رخ نماید چوں صبح صادق
گوید بلالؓ از آوازِ خوشتر اللہ اکبر اللہ اکبر
پروائے عالم امجدؔ ندارد کاؤس و کے را کے بر شمارد
ساقی کوثر در داد ساغر اللہ اکبر اللہ اکبر

**نذرِ امجدؔ**

اس میں ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات ہیں۔ جب کفار و مشرکینِ مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ستانا اور تنگ کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی زندگی دوبھر ہو گئی تو ایک ایک کر کے مسلمان مدینے کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہجرت کا حکم ملا تو آپ نے ایک رات جبکہ کفارِ مکہ نے آپ کے قتل کے ارادے سے مکان کا محاصرہ کر لیا تھا حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سلا کر اور حضرت صدیق اکبرؓ کو ہمراہ لے کر مدینہ کا پیدل سفر فرمایا۔ نذرِ امجدؔ اسی واقعہ کی تفصیل ہے۔ ساری نظم میں ذاتِ اقدس سے جس والہانہ محبت و عقیدت کا اظہار ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

مدینے کو جاتا ہے ماہِ رسالتؐ ملا رب کعبہ سے فرمانِ ہجرت
اُٹھائے ہے صدیقؓ بارِ نبوتؐ صد آفت کی آغوش میں ہے محبت

یہ نورٌ علیٰ نور کی شان دیکھو

صداقت کے پہلو میں ایمان دیکھو

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے روانہ ہوئے تو مکہ کے در و دیوار کا آہ و بکا سے اور شجر و حجر کا غم سے جو نقشہ تھا اس کو امجد نے بڑے اچھے انداز سے بیان کیا ہے۔

شہنشاہِ کونین نکلا جو گھر سے　　دھواں سوزِ فرقت کا اُٹھا جگر سے
زمیں سے زماں سے شجر سے حجر سے　　اُٹھا شور کعبہ کی دیوار و در سے
چلا تو کہاں؟ رب کے گھر کے اُجالے
نہ جا چھوڑ کر ہم کو او جانے والے

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے روانہ ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ سے بادِ بہاری چل رہی ہے اور گل مدینہ کو جا رہا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی رحمت مکہ سے رخصت ہو رہی ہے جس کے رنج و غم سے ذرہ ذرہ آہ و زاری میں مصروف ہے۔

چلی صحنِ کعبہ سے بادِ بہاری　　مدینہ کو جاتی ہے گل کی سواری
ہوئی رخصتِ رحمتِ ربِ باری　　ہر اک غم میں کرتا ہے فریاد و زاری
کوئی کہہ رہا ہے جگر کو سنبھالے
اِدھر دیکھ لینا اُدھر جانے والے

دلوں میں بے چینی اور تڑپ تھی اور غم سے ہر ایک سوگوار تھا۔

بہے دریائے خوں چشمِ زمزم سے جاری　　سوادِ حرم میں ہے اک سوگواری

ہر اک دل میں ہے برق سی بیقراری ہر اک کی صدا ہے کہ سن لے ہماری

نہ جا ہم سے منہ موڑ کر جانے والے

یہاں کون ہم بیکسوں کو سنبھالے

رحمتِ عالمؐ کی جدائی سے نہ صرف قلوبِ انسانی پہ بلکہ حجر و شجر پہ بجلی گری اس کا اندازہ لگائیے کہ کس سادگی سے اظہار ہوا ہے۔

صفا مروا کا دل ہوا پارہ پارا وہ بجلی گری پھٹ گیا سنگِ خارا

ہوا غم سے کعبہ سیہ پوش سارا تڑپ کر یہ غارِ حرا نے پکارا

کہاں تو چلا میرے نازوں کے پالے

پھر آ میری آغوش میں جانے والے

کعبہ کا اپنے حبیب اور نگہبان کی فرقت میں گڑگڑاتے ہوئے درد بھرے انداز سے مخاطب کر کے مدینہ نہ جا کہہ کر واپس لوٹ جانے کی التجا کرنے کی تصویر کس ندرت سے کھینچی ہے۔

پھر آ اپنے گھر میرے گھر کے اجالے مدینے نہ جا میرے نازوں کے پالے

پھر اک بار قدموں سے اپنے لگا لے ادھر آ ادھر آ مرے جانے والے

ارے کعبہ والو! دہائی دہائی

چہل سالہ لٹتی ہے میری کمائی

چونکہ رحمتِ عالمؐ مکہ سے مدینے کے لیے روانہ ہو چکے تھے اس لیے غارِ ثور ادھر منتظر تھا اس اطمینان کے ساتھ کہ حکمِ خداوندی ٹل نہیں سکتا چاہے کوئی کتنا ہی بلائے۔

اُدھر ثور چیخا کہ میں منتظر ہوں چلے گا کسی کا نہ اب کوئی افسوں
بُلاتا ہے کون آج مَیں بھی تو دیکھوں ہے شمس و قمر کے لیے ثور موزوں

بنے گا حمل آج یہ ثور سا بُرج
نہ ہوگا فلک پر بھی اس طور کا بُرج

جب آنحضرت صلعم غار ثور پر تشریف لائے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے غار کو اچھی طرح پاک وصاف کر کے غار کے سوراخوں میں اپنے کپڑوں کے ٹکڑے بھر دیئے۔ غار میں داخل ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یار غار کے زانو پر سر رکھ کر آرام فرمایا۔

صبح کو کفارِ مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلے اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے غارِ ثور تک پہنچے۔ آہٹ پاتے ہی صدیق اکبرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض حال کیا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللہَ مَعَنَا" (گھبراؤ نہیں یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے)

دل کے اندھوں نے جب تجلّی الٰہی کو سامنے سے گزرتے ہوئے نہ دیکھا تو اب غار کے اندر کیا دیکھ سکتے تھے۔ مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبرؓ تین دن اس غار میں ٹھیر کر چوتھی شب کو مدینے کی طرف روانہ ہوئے۔

ہوئے ثور سے پھر مدینے کو راہی نہ ماہی مراتب نہ فوج و سپاہی
مگر ہاتھ میں ہے دو عالم کی شاہی چمکتا ہے چہروں سے نورِ الٰہی

فلک کی صدا ہے محمدؐ یہی ہے

اَحَد کہہ رہا ہے کہ احمدؐ یہی ہے

اُدھر مدینہ کا ذرّہ ذرّہ آپؐ کی آمد کا بے چینی سے منتظر تھا خوش آمدید کہنے کے لیے بے چین تھا۔ ہر طرف آنحضرتؐ کی آمد کی خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ہر ایک کی زبان پر صَلِّ علیٰ کا نغمہ جاری ہو گیا۔ امجد اس کی کتنی اچھی تصویر کھینچتے ہیں۔

مدینے میں اب آمدِ مصطفیٰؐ ہے جدھر سنئے آوازِ صَلِّ علیٰ ہے
خوشی ہے مسرّت ہے فضلِ خدا ہے مبارک سلامت کا غل ہو رہا ہے

شجر کہہ رہا ہے سَلَامٌ عَلَیْکُمْ
حجر کہہ رہا ہے سَلَامٌ عَلَیْکُمْ

غرض مدینہ کا ذرّہ ذرّہ سَلَامٌ عَلَیْکُمْ کے فلک شگاف نعروں سے رسولِ اکرم صلعم کا استقبال کرتا ہے۔

نبیّ مکرّم سَلَامٌ عَلَیْکُمْ شہِ ہر دو عالم سَلَامٌ عَلَیْکُمْ
رسالت کے خاتم سَلَامٌ عَلَیْکُمْ غریبوں کے ہمدم سَلَامٌ عَلَیْکُمْ

بگوید زمین و زماں با ترنّم
سَلَامٌ عَلَیْکُمْ سَلَامٌ عَلَیْکُمْ

رسولِ اکرمؐ کی بزرگی کا نقشہ کس سادگی سے پیش کرتے ہیں غور طلب ہے۔

وہ رحمت دو عالم کی کہلانے والا وہ کثرت میں توحید سکھلانے والا
وہ نعلین سے عرش پہ جانے والا وہ شمعِ ہدایت کے ساتھ آنے والا

عجیب آن والا عجیب شان والا

وہ رحمٰن والا وہ قرآن والا

رسول اکرمؐ کی مدینہ میں آمد پر انصار آپ کو لینے کے لیے بے چین ہیں۔ ہر ایک یہ چاہتا اور آرزو کرتا ہے کہ آپ اس کے گھر ٹھہریں۔

محبت میں آنکھیں بچھاتا ہے کوئی    تصور میں صورت جماتا ہے کوئی
سنبھالے ہوئے دل کو آتا ہے کوئی    ادھر دل ہی دل میں بلاتا ہے کوئی

محبت کا سودا ہے ہر ایک سر میں
ہر اک چاہتا ہے رہے میرے گھر میں

غرض ہر ایک کی یہی دلی تمنا اور خواہش ہے کہ رحمتِ عالمؐ اس کے گھر ٹھہریں تو کیا اچھا ہو۔

کوئی کہہ رہا ہے کہ آنکھوں میں آؤ    کوئی کہہ رہا ہے کہ دل میں سماؤ
کوئی کہہ رہا ہے کہ صورت دکھاؤ    کوئی کہہ رہا ہے اب آ گئے نہ جاؤ

مرے دل میں آجاؤ ایمان بن کر
اتر آؤ سینے میں قرآن بن کر

لیکن دوسری طرف رحمتِ عالمؐ نے کسی کی دل شکنی نہ ہونے کے خیال سے تمام قیام ناقہ کے ہاتھ میں دے دی۔ اس عالم میں حضرت ایوب انصاریؓ کے مقدر دیکھیے کہ ناقۂ مبارک آپ کے مکان پر ٹھہر گیا اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی جگہ قیام فرمایا۔

نصیب ابو ایوبؓ اک بار چمکا    وہیں ناقہ ٹھہرا رسولِ اممؐ کا

اُتر آیا ساحل پہ دریا کرم کا   دو عالم سے دھویا گیا نقشِ غم کا

محبت نے آخر محمدؐ کو کھینچا

دلی جذب نے اپنے مقصد کو کھینچا

آخر میں امجد کی دعا و مناجات کو دیکھئے کہ کس سادگی اور ندرت سے پیش کی گئی ہے۔

بر آئے ہماری بھی امید یا رب   نظر آئے کثرت میں توحید یا رب

کوئی ایسی پیدا ہو تمہید یا رب   ہمارے بھی گھر ہو کبھی عید یا رب

فقیروں کے ہاں آئے شاہِ مدینہ

اُتر آئے آنکھوں میں ماہ مدینہ

کبھی ہر قدم پہ ہم آنکھیں بچھائیں   کبھی با ادب ہو کے سر کو جھکائیں

کبھی ہوں تصدق کبھی لیں بلائیں   کبھی لیں بلائیں کبھی دیں دعائیں

محمدؐ جو مل جائیں کیا کیا کریں ہم

خدا کی قسم اک تماشا کریں ہم

کبھی آ گئے نزدیک دیکھا کریں ہم   کبھی دور ہٹ کر نظارہ کریں ہم

کبھی گر کے قدموں پہ رویا کریں ہم   کبھی رو کے ان کو ہنسایا کریں ہم

محمدؐ جو مل جائیں کیا کیا کریں ہم

خدا کی قسم اک تماشا کریں ہم

کریں گے کبھی عاجزانہ خوشامد   کہیں گے کبھی ان سے ہم دل کا مقصد

محبت میں امجد رہے گا زباں زد   محمدؐ محمدؐ محمدؐ محمدؐ

محمدؐ جو مل جائیں کیا کیا کریں ہم
خدا کی قسم اک تماشا کریں ہم

**خرقۂ امجدؔ سی پیوند ہے**

اس کا مطالعہ انسان کو حقیقی معنی میں انسان اور مسلمان کو صحیح معنی میں مسلمان بناتا ہے عالم اجسام میں روحانیت کی تصویر "مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ" کی دل میں اُتر جانے والی تصویر ہے۔ عبد کی روش معبود کی کشش دل پر عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اس سی پیوند کے متعلق خود امجدؔ کہتے ہیں:۔

قدموں میں ترے گڑی ہیں لاکھوں آنکھیں
رستہ میں ترے پڑی ہیں لاکھوں آنکھیں
پیوند سمجھ رہا ہے تو۔ آکے تو دیکھ
گدڑی میں میری جڑی ہیں لاکھوں آنکھیں

بقول ڈاکٹر اقبال "یہ حقائق سے معمور ہے" اور ضامن صاحب کے خیال میں "اس خرقے کے تیسوں پیوند جگر پارے ہیں۔

خرقۂ امجدؔ سی پیوند سے متعلق ایک انگریز ماہر السنہ شرقیہ ٹی گراہم بیلی نے (جو لندن یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر تھے) اپنی تحریر کے ذریعے جس رائے کا اظہار کیا تھا اس کو بجنسہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ خرقۂ امجدؔ کی خوبیوں سے متعلق صحیح اندازہ ہوسکے۔

**London E. C. 2**
10-11-1930.

Dear Amjad,

I am very glad to see that you are a religious poet .The older we grow the more we feel the need of God and Religion and all it stands for. I trust that the hope you expressed in the end of the preface of **Khirqa -E- Amjad** may have been fulfilled and that not only one but many people of 'bey-chain dil' may have received consolation through the reflection on religion contained in that and other of your books.

T. GRAHAME BAILEY.

خرقۂ امجد کی تیسوں نظمیں صوفیانہ رنگ لی ہوئی ہیں ہر ایک کا عنوان الگ ہے۔ جو قرآن کی کسی نہ کسی آیت پر مشتمل ہے۔ مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَا۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ اَکْرَمُکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ۔ ان اللّٰہ لطیف بِالْعِبَادِ ۔

تصوف میں سب سے زیادہ اہمیت تزکیۂ نفس کو دی جاتی ہے۔ جس سے گزرنے کے بعد سلوک کی نوبت آتی ہے کیونکہ جب تک نفس مادی خواہشات سے پاک وصاف نہیں ہو جاتا جسم اور قلب میں طہارت پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ سلوک کا راستہ طے ہو سکتا ہے۔ تزکیۂ نفس والی نظم سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو

آئینہ پہ سانس سے نہ آجائے غبار ۔۔۔ پہنچے نہ ہوائے نفس ہوتک ہشیار
آنچ آئے نہ اُس کی آبرو پر ہشیار ۔۔۔ نشتر نہ لگے رگِ گلو پر ہشیار
ہاں روک لے اس کشتی طوفانی کو ۔۔۔ چلنے ہی نہ دے ہوائے نفسانی کو
ہے نفس ہی تیرا۔ تیرا دشمن ہشیار ۔۔۔ اے طالب زلیت النفس امارہ کو مار
شیطان کی پیروی نہ کر اے انساں ۔۔۔ مومن ہے اگر تو مان رب کا فرمان

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِهٖ کے تحت شریعت اور طریقت کے پہلو کو جس خوبی سے ادا کیا گیا ہے قابلِ غور ہے۔ امجد مسلمانوں کے لیے شریعت و طریقت دونوں کو لازمی بتاتے ہیں۔

خوش ہم سے رہے جاناں ہم عید اسے کہتے ہیں ۔۔۔ بس ایک کے ہو جانا توحید اسے کہتے ہیں

گر تا ترے قدموں پہ ہے عین نماز اپنی — ہے اس میں سرافرازی اے بندہ نواز اپنی

مر جانا محبت میں ہے عین حیات اپنی — نقد دل و جاں دینا گویا ہے زکوٰۃ اپنی

عاشق کے لیے حج بھی اک خاص بہانہ ہے — ہم کو در جاناں تک ہر حال میں جانا ہے

تفسیر ہو یا قرآں سب ایک ہی مطلب ہے — اسلام کے ارکاں ہیں یا عشق کا مذہب ہے

جو کچھ ہے شریعت میں وہ عین طریقت ہے — توحید محبت ہے توحید محبت ہے

**رباعیات**

امجد کی رباعیاں اردو شاعری میں ایک بے مثل سرمایہ ہیں۔ امجد کے متعلق پروفیسر وحید الدین سلیم کا یہ خیال مبالغہ نہیں ہے کہ "ان کی ٹکر کا رباعی کہنے والا شاعر نہیں ہے۔" اقبال کے نظریہ کے مطابق "ہر رباعی قابلِ داد ہے۔ جن کے پڑھنے سے ایک قسم کی روحانی مسرت نصیب ہوتی ہے۔"

فارسی کے لازوال رباعی گو صوفی شاعر سرمد اور امجد میں بہت کچھ مناسبت ہونے کے سبب سے گرامی نے انھیں اپنی ایک رباعی میں جوابِ سرمد سے تعبیر کیا ہے۔

رباعی کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک ہی مضمون باندھا جائے۔ پہلے مصرعے میں جو خیال پیش کیا جائے اس کو دوسرے دو مصرعوں میں بڑھا کر چوتھے مصرعے میں منتہا تک پہنچا دیا جائے۔ اس اعتبار سے ڈرامائی زور رباعی کا اصل اصول ہے امجد کی تمام رباعیوں میں ہر درجے کی ڈرامائیت پوشیدہ ہوتی ہے۔ ان کا آخری مصرعہ ایسا برجستہ اور اتنا پراثر ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے پوری رباعی میں ایک متحرک روح پیدا ہو جاتی ہے۔ پڑھنے والا ایک اختتامی احساس سے آگے بڑھتا ہے۔ ذیل کی رباعی

ملاحظہ ہو ۔

اس سینے میں کائنات رکھ لی ہیں نے
کیا ذکر صفات ذات رکھ لی ہیں نے
ظالم سہی جاہل سہی نادان سہی
سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی ہیں نے

امجد کی رباعیوں سے متعلق جن قابل اور لایق مشاہیر نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی رباعیوں کے لاثانی اور لافانی ہونے کا ثبوت ملتا ہے ۔ جن میں سے چند کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے ۔

علامہ اقبال :۔ "ہر رباعی قابلِ داد ہے ۔ ان کے پڑھنے سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے ۔"

مولانا عبداللہ عمادی :۔ "معراج سخن میں شاہد معنی کو ہر ہفت دیکھنا ہو تو رباعیات امجد کو دیکھئے ۔"

علامہ علی حیدر نظم طباطبائی :۔ "رباعیاتِ امجد کی داد دینا سخن شناسی کا مقتضا ہے"

مولانا مناظر احسن گیلانی :۔ "حضرتِ امجد ہندوستان کے ان شعراء میں ہیں جن کو زمانہ صدیوں کے بعد پیدا کرتا ہے ۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی :۔ "رباعیاتِ امجد معنویت کی بلندی اور طرز ادا دونوں حیثیت سے قابلِ داد ہیں ۔"

مولوی عظمت اللہ خاں عظمت :۔ "رباعیاتِ امجد زندگی کے اعلیٰ ترین رخ کی تفسیر ہیں اور بہ لحاظِ ادب اظہارِ خیال کا بہترین نمونہ ہے ۔"

پروفیسر وحید الدین سلیم :۔ "امجد صاحب قدرتی شاعر ہیں میصرین کی رائے میں اس وقت ہندوستان میں ان کی ٹکر کا رباعی کہنے والا کوئی شاعر نہیں ۔"

مولانا عبدالقدیر صاحب صدیقی:۔ ہر رباعی سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ہر عنوان سے حیرت کتنے عمیق مشاہدے کے بعد ایک زبردست لکچر کا خلاصہ رباعی میں بیان کیا گیا ہے پھر اُسی عنوان میں ایک لفظ میں ادا کیا ہے۔ یہ چیزیں نہ تعلیم سے حاصل ہوتی ہیں نہ تعلم سے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

مولانا سید سلیمان ندوی:۔ "حضرت امجدؔ کی ہستی نہ صرف سرزمینِ دکن کے لیے بلکہ سارے ہندوستان کے لیے باعثِ فخر ہے، آپ نے اپنی شاعری میں انفرادیت کی شان پیدا کرلی ہے۔"

مولوی الیاس برنی:۔ "ایسے ہی کلام سے یقین ہوتا ہے کہ شاعری جزویست از پیغمبری"

جس طرح اوپر بیان کیا گیا ہے کہ امجدؔ کے کلام کا ماخذ قرآن اور حدیث ہے انھوں نے اسلامی تعلیمات کو اپنی شاعری میں اس طرح سمویا ہے کہ وہ قرآن اور حدیث سے ہٹ کر کوئی بات ہی نہیں کہتے ان کی ہر رباعی کسی نہ کسی آیتِ قرآنی یا حدیث کی تشریح ہوتی ہے اس لیے وہ تمام دنیوی رشتوں اور تعلقات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو     منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو     بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

امجدؔ اس رباعی کے ذریعے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ساری دُنیا کے انسانوں کو یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کا قانون جو انسانی فطرت کے عین مطابق اور عزت نفس کا محافظ ہے اور خالق و مخلوق کے رابطہ کا سچا مظہر ہے۔ اگر انسان اس کو اپنا لے تو صحیح معنیٰ میں انسان انسان بن سکتا ہے اور آج بھی اَلَيْسَ اللّٰهُ

بکاف عبد کا اس کو ساری دُنیا سے مستغنی کر سکتا ہے اور وہ اپنے نفس کو مطمئن کر کے رب سے راضی اور غیر اللہ سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔

امجدؔ کی رباعیاں انسانی زندگی کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ جو زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی نقاب کُشائی کرتی ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ انسان محفلِ عیش میں نہایت خوش و خرم رہتا ہے۔ جہاں وہ یہ بھول جاتا ہے کہ مسرت و راحت کی گھڑیاں دیرپا نہیں بلکہ جلد گزر جانے والی ساعتیں ہیں۔ جب یہ گھڑیاں ختم ہو جاتی ہیں تو یہ ہر انسان کو غم و رنج کا شکار ہونا پڑتا ہے ابتداءً وہ دُنیا کو پائدار اور دل لبھانے والی چیز سمجھتا ہے لیکن جب موت اس کا استقبال کرتی ہے تو زندگی و موت اور مسرت و غم کی حقیقت اس پر آشکار ہو جاتی ہے۔ اسی مضمون کو امجدؔ نے ذیل کی رباعی میں جس خوبی سے پیش کیا ہے قابلِ غور ہے۔

ہر محفل سے بحالِ خستہ نکلا ہر بزمِ طرب سے دل شکستہ نکلا
منزل ہی نہیں یہاں مسافر کے لیے سمجھا تھا جسے مقام رستہ نکلا

زندگی کی ہر شئے پر وسیع نظر رکھنے والے کے دل میں دولت کا بے جا غرور خار سے زیادہ کھٹکتا ہے۔ دُنیا کی بے ثباتی اور دولت کی تغیر پذیریات کے پیشِ نظر امجدؔ اس کو سراب سے زیادہ نہیں سمجھتے اور وہ ان مغرور دولت مندوں کو جو اپنی دولت کے نشہ میں چُور رہتے ہیں نادان سمجھتے ہیں۔

دولت کا غرور سب ہوائی نکلا سونے کا پہاڑ آج رائی نکلا
ہیں ناچ شہنشہی سمجھتا تھا جسے تقدیر سے کاسہ گدائی نکلا

امجدؔ کی ذیل کی رباعی میں دل کو خانۂ خدا سے تشبیہہ دی گئی ہے اور اس دل کے توڑنے کو خدا کے توڑنے کے برابر سمجھا گیا ہے یعنی دل خانۂ خدا ہے اس لیے کسی کے دل کو توڑنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اسی مفہوم کو امجدؔ نے اپنی رباعی میں پیش کرتے ہوے بتایا ہے کہ کسی کے دل کو خوش رکھنا تمام عبادتوں سے افضل ہے۔

مغموم کے قلبِ مضمحل کو توڑا　　یا منزلِ فیضِ متصل کو توڑا
کعبہ ڈھاتا تو پھر بنا بھی لیتے　　افسوس یہ ہے کہ تو نے دل کو توڑا

تصوف میں وحدت الوجود اور ہمہ اوست کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے جس کو بڑے بڑے علماء اور صوفیا حل نہ کرسکے لیکن امجدؔ کو دیکھیے کہ دوئی کا وہم وگمان کرنے والوں کو نادان سمجھتے ہیں اور کائنات کے ذرّے ذرّے میں خدائے واحد کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ حقیقت بیں کے مشاہدات کو خود ان ہی کی زبانی سنئیے۔

واجب سے ظہورِ انسانی ہے　　وحدت میں دوئی کا وہم نادانی ہے
دھوکا ہے نظر کا ورنہ عالم ہمہ اوست　　گرداب۔ حباب۔ موج سب پانی ہے

ذیل کی رباعی میں وحدت الوجود کے مسئلہ کو کس خوبصورتی سے حل کیا ہے۔

ہیں مستِ مئے شہود تو بھی میں بھی　　ہیں مدعی نمود تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں　　ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

امجدؔ کی قادر الکلامی ذیل کی رباعی میں ملاحظہ کیجیے جہاں انسان کی

انانیت کا پردہ چاک کرتے ہیں۔

گیسو میں ہے بل کہ سہرے خم کو دیکھو ... رخ ہنستا ہے کہ اس ستم کو دیکھو
اظہارِ کمال میں ہر اک کامل ہے ... سب کی یہی خواہش ہے کہ ہم کو دیکھو

ذیل کی رباعی میں امجدؔ نے مایوس اور نا امید انسان کو ارتقاء کی جو تعلیم دی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ اولالعزمی اور بلند پروازی کا عالم ملاحظہ ہو۔

اے قطرۂ آب بھیل، دریا ہو جا ... اے طائرِ رُوح مرغ سدرہ ہو جا
اپنی ہستی کو خاک میں دفن نہ کر ... اے تودۂ خاک اُٹھ بگولہ ہو جا

اس نام و نمود کی دُنیا میں جہاں خدا کے وجود کا انکار کیا جاتا ہے وہیں ظاہری نمایش اور عارضی شہرت کا شوق ہی پیش نظر رہتا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے وہ یہ کہ صحیح شہرت کے مستحق کبھی بھی ظاہری نمود و نمایش نہیں چاہتے اور جھوٹی تعریفوں کی خواہش سے ہمیشہ بے نیاز رہنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ یہی چیز امجدؔ میں بھی پائی جاتی ہے۔ ذیل کی رباعی ایسے لوگوں کے لیے پیامِ حیات ہے جو زندگی کی کشمکش سے مایوس ہو کر اپنی بے قدری کا گلہ کرتے ہیں۔ ان ناکام دلوں کے لیے جو اپنی بے قدری پر آنسو بہاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دُنیا قدردانی کی جگہ نہیں۔ امجدؔ ان کی اس طرح دلجوئی کرتے اور دلاسا دیتے ہیں۔

کیا فکر ہے کوئی قدرداں ہو کہ نہ ہو ... جھوٹی دُنیا میں عز و شاں ہو کہ نہ ہو
اللہ مسرتِ حقیقی دے دے ... ہم زندہ رہیں نام و نشاں ہو کہ نہ ہو

امجد نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات۔ وحدانیت اور حقیقت و معرفت پر کئی رباعیاں لکھی ہیں۔ ان اہم مسائل پر سادہ اور عام فہم انداز میں جو روشنی ڈالی ہے وہ قابل فہم ہے۔ ذیل کی رباعی "وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ" کی تفسیر دیکھئے۔ کس اچھوتے انداز سے بیان کی ہے۔

ہر ذرہ پہ فضلِ کبریا ہوتا ہے　　اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دبی زبان سے یہ کہتے ہیں　　وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

اس رباعی میں امجد نے انسان کی مذہب سے دوری اور بت پرستی کا نقشہ کھینچ کر یہ بتایا ہے کہ پتھر کو خدا بنا کر جو عزت دی ہے اور خود انسان اشرف المخلوقات ہو کر اپنے سے کم تر شئے کی پرستش میں مبتلا ہے یہ اس کے ذلالت کا مقام ہے۔

"وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ" کی تفسیر کو امجد کی ذیل کی رباعی میں دیکھئے۔

ضائع فرما نہ سرفروشی کو مری　　مٹی میں ملا نہ گرمجوشی کو مری
آیا ہوں کفن پہن کے اے ربِ غفور　　دھبا نہ لگے سپید پوشی کو مری

انسان کی فطرت ہے کہ وہ اکثر گزری ہوئی باتوں پر سوچتا ہے اور اس کے اسباب و علل پر غور کرتا ہے۔ ہر چیز مقدرات سے ہے جو کچھ ہوتا ہے سب قانونِ فطرت کے تحت ہے۔ جب کوئی چیز غیر متوقع طور پر ہو جاتی ہے یا نہیں ہوتی تو انسان اس کی کھوج اور جستجو میں رہتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا۔ اس کے باوجود وہ اس کو سمجھ نہیں سکتا حتیٰ کہ موت آجاتی ہے۔

اسباب و علل کا دور کرتے رہئے　　اپنی فطرت پہ جور کرتے رہئے
جو کچھ ہونا تھا ہو چکا رُک نہ سکا　　اب کیوں ہوا اس پہ غور کرتے رہئے

نادان دانا نہیں ہو سکتا کے نکتے کو سمجھانے کا امجد کا نیا انداز اور حکیمانہ استدلال دیکھئے۔ کہتے ہیں کہ تعلیم کے باوجود بھی جاہل جاہل ہی رہتا ہے۔

ہم صحبت بے خرد پریشان رہا　　نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی　　نادان کو اُلٹا بھی تو نادان رہا

امجد کا کلام ان کے قلبی واردات اور انکشافات کا آئینہ دار ہے موجودہ زمانے میں جب کہ لوگ مذہب سے دُور اور اشتراکیت سے قریب ہوتے جا رہے ہیں دیگر باتوں کے ساتھ خدا کے وجود کا انکار کرنا بھی داخلِ فیشن ہو گیا ہے اور اکثر نوجوان بغیر سوچے سمجھے اپنے خالق سے منحرف اور اپنے معبود سے منکر ہوتے جا رہے ہیں اس لیے امجد نے ان منکرانِ خدا کو جواب دیتے ہوے واضح اور روشن دلائل کے ساتھ خدا کے وجود کو جس خوبی سے ثابت کیا ہے۔

بجتا ہو ستار اور مضراب نہ ہو　　پھیلی ہوئی چاندنی ہو مہتاب نہ ہو
ممکن ہی نہیں حباب ہو آب نہ ہو　　ہاں ہیں نہیں ہو سکتا نہ ہو تو جب تک

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "میں انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں" لیکن حضرتِ انسان کو اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا اس لیے امجد اس تصور کے تحت اللہ تعالیٰ سے یوں ہم کلام ہوتے ہیں۔

دونوں یکجا مگر ملاقات نہیں
باہم کوئی گفتگو نہیں بات نہیں
تو مجھ سے قریب تر میں تجھ سے نزدیک
کیا بات ہے ہم دونوں میں کیوں بات نہیں

یہ سن کر اللہ تعالیٰ نہایت دلکش انداز میں یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

بدلی چھائی ہوئی ہے برسات نہیں
تارے نکلے تو ہیں مگر رات نہیں
کچھ اس کا سبب بھی تو نے سمجھا اعجد
میں ہوں تیرے ساتھ تو میرے ساتھ نہیں

ذیل کی رباعی کے ذریعے امجد نے اہل دنیا کو وہ پیغام دیا ہے جو حقیقت میں امن کا پیغام اور مساوات کا درس ہے۔

ہر شخص کے دل کو خوش رکھو عید یہ ہے
ہر چیز کو اچھا کہو تمجید یہ ہے
مخلوق خدا ہے سب خدا کی مخلوق
سب کو تم ایک سمجھو توحید یہ ہے

عبادت کے تصور اور نماز کے فلسفے کو امجد نے جس سادگی اور لطافت سے پیش کیا ہے بے نظیر ہے۔

دامان گناہ چاک ہو جاتا ہے
نفس سرکش ہلاک ہو جاتا ہے
مومن کے لیے عجیب نعمت ہے نماز
سر خاک پہ رکھ کے پاک ہو جاتا ہے

ذیل کی رباعی میں اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ جب خدا کی عبادت نہ کی جائے تو پھر کسی کو زمین پر رہنے کا حق نہیں۔

پایا نہ حیات کا ثمر اک دن بھی
ہم کو نہ ہوا خدا کا ڈر اک دن بھی
کیا حق ہے زمیں پہ پاؤں رکھنے کا ہمیں
رکھا نہیں جب سجدے میں سر اک دن بھی

**اخلاقی رباعیاں** ذیل میں وہ رباعیاں پیش کی جاتی ہیں جو فلسفۂ اخلاق سے متعلق اور سیرت و کردار کی درستی کی

ضامن ہیں چنانچہ انسان کی برائیوں اور گناہوں کا عالم دیکھیے کہ وہ معمولی معمولی بات پر کس طرح انسانی خون سے ہولی کھیلتا ہے۔

اک اک کی تاک میں لگا رہتا ہے ۔۔۔ خوں ایک کا اک کے ہاتھ سے بہتا ہے
انسان کے خبث باطنی کے آگے ۔۔۔ شیطان بھی لاحول ولا کہتا ہے

عام طور پر انسان کا ظاہر و باطن یکساں نہیں ہوتا۔ بعض لوگ دیکھنے میں نہایت شریف اور نیک معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے باطن میں شر، فساد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ یعنی دوسروں کو پند و نصیحت کرتے ہیں لیکن خود گرفتار بلا ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی صرف قول تک محدود ہوتی ہے۔ فعل سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کو عمل کی دعوت دیتے ہیں اور خود عمل نہیں کرتے لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو دیکھنے میں تو نیک نہیں معلوم ہوتے لیکن ان کی طبیعت میں نیکی اور انسانی ہمدردی کا جذبہ بہت ہوتا ہے۔ امجد نے ذیل کی رباعی میں ظاہر و باطن کے اسی فرق کو نہایت مدلل اور سلیس طریقے پر نمایاں کیا ہے۔

تقریر نوشتن چھپکے اثر بھی دیکھو ۔۔۔ باتیں تو بہت ہوئیں ہنر بھی دیکھو
ہوتا نہیں ظاہر پہ قیاس باطن ۔۔۔ دلق اطلس کا استر بھی دیکھو

انسان کے لیے اطاعت ضروری چیز ہے کیونکہ زندگی بسر کرنے کے لیے کسی نہ کسی کی اطاعت کرنی پڑتی ہے اس لیے اطاعت ایسی ہونی چاہیے جس خود تمالی کا کہیں گزر نہ ہو اس نکتہ کو امجد نے دیا سلائی کی تمثیل سے کس خوبی سے بیان کیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی
طاعت میں نہیں ہے خود نمائی اچھی
اک سجدے میں خاک کر دیا ہستی کو
حضرت! تم سے دیا سلائی اچھی

اس رباعی میں خود نمائی کی مذمت دیکھئے :-

مر مٹتے ہیں ذلیل خواہش کے لیے
پالیدہ ہوئی ہے روح کاہش کے لیے
ہر حال میں ہے مفاخرت مد نظر
پتلے مٹی کے ہیں نمایش کے لیے

اکثر دیکھا گیا ہے کہ انسان اپنی قدر کا آرزومند اور طالب رہتا ہے اگر اس کی قدر نہ ہو تو وہ گلہ شکوہ کرنا شروع کر دیتا ہے اس لیے امجد اہل دنیا کو بتاتے ہیں کہ قدر نہ ہونے پر گلہ شکوہ کرنا مناسب نہیں کیونکہ دنیا قدر دانی ہونے پر ماتم کرنے کے لیے نہیں ۔

دنیا نہیں جائے کامرانی کے لیے
مجلس یہ نہیں مرثیہ خوانی کے لیے
جب ما قدروا اللہ خدا کہتا ہے
کیا روتے ہو اپنی قدر دانی کے لیے

کم ظرف انسان کو اگر کہیں سے دولت مل جاتی ہے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور غرور و تکبر کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کوئی اس کی نظر میں نہیں جچتا۔ دوسروں کو وہ گری ہوئی نظر سے دیکھتا اور حقیر سمجھتا ہے۔ امجد کی زبان سے اس کم ظرفی کی مذمت اور برائی سنئے ۔

۱۱ کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے
مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس
تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

امجد ذیل کی رباعی میں قناعت کی تعلیم نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں اس طرح دیتے ہیں کہ بڑے بڑے عالموں کے پند و نصائح بھی اتنا

اثر نہیں کرتے۔

گرمی میں غم لبادہ نازیبا ہے  مستی میں خیال بادہ نازیبا ہے
کافی ہے ضرورت کے موافق دنیا  جامہ قد سے زیادہ نازیبا ہے

امجد کی رباعیات میں انفعال کی تفسیر دیکھئے کس قدر اچھوتی ہے :

پیاسوں پہ کرے گا مہربانی پانی  آتش پہ کرے گا حکمرانی پانی
کیا نارِ سقر جلا سکے گی واعظ  خود شرم سے ہو رہا ہوں پانی پانی

دنیا میں انسان کو جب کسی بڑے آدمی کا قرب حاصل ہوتا اور مصاحبت نصیب ہوتی ہے تو لوگ اس کے متعلق خیال کرتے ہیں کہ بہت بڑے مقام پر ہے لیکن امجد اس کی اس طرح مذمت کرتے ہیں۔

عزت نہ ملی کبھی مصاحب ہوکر  بے قدر ہوا ہے قلب قالب ہوکر
موجود میں سو عیب نظر آتے ہیں  ہر چیز پسند آتی ہے غائب ہوکر

آج انسان مذہب سے دور ہوکر جن گمراہیوں اور ذلالتوں میں پڑا ہوا ہے اس گندگی سے نکلنے اور نیک کام کرکے صحیح معنوں میں انسان بننے کے لیے امجد نصیحت آمیز انداز میں یوں ہدایت کرتے ہیں۔

اس نام کی زندگی میں کچھ جان تو ہو  گر بن نہ سکے فرشتہ انسان تو ہو
نیکی نہ ہوئی نہ ہو بدی بھی تو نہ کر  صوفی نہ ہوا نہ ہو مسلمان تو ہو

امجد کی اکثر رباعیاں فلسفیانہ ہیں۔ جن میں فلسفہ سے متعلق بڑے بڑے مسائل کو حل کیا گیا ہے۔

گردش میں یہ گردباد آخر کب تک  طرح کون و فساد آخر کب تک

اضداد میں اتحاد آخر کب تک　　ٹوٹے گا طلسم مادیت کا اک دن

انسان کی زندگی حرکت سے ہے اس کے بغیر حیات کا تصور بھی غلط ہے انسان کے جسم میں ایک مشین کی طرح سیکڑوں کل پرزے کام کرتے ہیں اور جب تک انسان کی سانس چلتی رہتی ہے یہ کل پرزے اپنا کام برابر جاری رکھتے ہیں اور جب اس سانس کا چلنا بند ہو جاتا ہے تو ہر کل پرزہ اپنی جگہ ساکت ہو جاتا ہے گویا جسم انسانی میں سانس ہی ایک ایسی شئے ہے جو جسم کے اندر آتی جاتی رہتی ہے اور اسی پر انسان کی زندگی کا انحصار ہے۔

سانچہ میں اجل کے ہر گھڑی ڈھلتی ہے　　ہر وقت یہ شمع زندگی جلتی ہے
آتی جاتی ہے سانس اندر باہر　　یا عمر کے حلق پر چھری چلتی ہے

دنیا میں جب تک انسان زندہ رہتا ہے مسلسل تگ و دو کرتا رہتا ہے اور ہر وقت اس کی حالت بدلتی رہتی ہے اور کسی حال میں بھی سکون و قرار نہیں رہتا اس لیے انسان کی اس متغیر حالت کا نقشہ سادہ اور سلیس الفاظ میں کھینچتے ہوئے امجد نے ذیل کی رباعی میں حرکت کے فلسفہ کو حل کیا ہے۔

فطرت کا تقاضا ہے کہ کاوش میں رہے　　دلچسپی عقل ہے کہ کوشش میں رہے
جب تو دہ خاک بھر رہا دن رات　　خاکی انسان کیوں نہ گردش میں رہے

ہر شئے کی زندگی اس بات کی دلیل ہے کہ موت اس کے لیے ایک دن ضروری ہے ہر سانس یہ بتا رہی ہے کہ زندگی عارضی ہے اور ختم ہوا چاہتی ہے کیونکہ زندگی موت سے قریب ہو رہی ہے اور موت ہر آن اس کے

استقبال کے لیے تیار کھڑی ہے۔ ہماری اس عارضی زندگی کا انجام معلوم نہیں کیا ہو۔ اس لیے کہ ایک صحت منداور تنومند انسان اب ہے اور کچھ دیر بعد نہیں۔ ابھی موجود تھا۔ ابھی غیر موجود۔ گویا ہر وقت عدم کا کھٹکا لگا ہوا ہے اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں۔ امجد اس خیال کی کس بہتر طریقے سے ترجمانی کرتے ہیں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

کب تک ہے یہ زندگی قضا کو معلوم — کب تک ہے بقائے تن فنا کو معلوم
جاتی تو ہوں واپسی خدا کو معلوم — ہر سانس یہ کہہ رہی ہے جاتے جاتے

دنیا کی کوئی شئے بیکار نہیں۔ ہر ذرہ مفید اور کار آمد ہے جو چیز بظاہر معمولی اور حقیر معلوم ہوتی ہے بعض وقت اس سے غیر معمولی نقصان پہنچتا ہے۔ مثلاً زہر کا ایک قطرہ انسان کی موت کے لیے کافی ہے۔ بجلی کی حرکت کیا سے کیا کر دیتی ہے اسی طرح ایٹم اور ہائیڈروجن بم اپنے میں ساری دنیا کو تباہ کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ اس فلسفہ کو امجد نے نہایت عمدگی سے حل کیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

نوحہ آخر میں راگ ہو جاتا ہے — گیسو لہرا کے ناگ ہو جاتا ہے
صرف ایک رگڑ سے آگ ہو جاتا ہے — ہرچند دیا سلائی اک تنکا ہے

دیا سلائی کی مثال سے امجد یہ بتاتے ہیں کہ کوئی شئے بیکار اور خالی از مصلحت نہیں۔ ہر شئے کے خواص معلوم ہونا دشوار ہے کیونکہ بہ لحاظ ماہیت اور ترکیب وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ماہرین و علمائے کیمیا اشیاء کی ترکیب اور ان کے خواص معلوم کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں

اس کے باوجود لاکھوں اشیاء ایسی ہیں جن کی ماہیت سے علمائے کیمیا آج تک لاعلم اور ناواقف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کوئی ذرہ اور کوئی مخلوق بیکار اور عبث نہیں ہے۔

اس جسم کی کینچلی میں اک ناگ بھی ہے  آواز شکستہ دل میں اک راگ بھی ہے
بے کار نہیں بنا ہے اک تنکا بھی  خاموش دیا سلائی میں اک آگ بھی ہے

ذیل کی رباعی میں امجد نے روح اور جسم کے تعلق کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ بے مثال ہے۔

بچپن ہی کے پہلو میں جوانی بھی تو ہے  باقی ہی کے آغوش میں فانی بھی تو ہے
سمجھے ہو غلط روح جدا جسم جدا  جو برف کی شکل ہے وہ پانی بھی تو ہے

امجد نے وحدت الوجود کے مسئلے کو مختلف رباعیوں کے ذریعے بیان کیا ہے جن میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

ذرہ ذرہ میں ہے خدائی دیکھو  ہر بت میں ہے شان کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم  ہر اک میں ہے مگر اکائی دیکھو

انسان ہزاروں ہیں مگر قسم ہے ایک  الفاظ بہ کثرت ہیں مگر اسم ہے ایک
اس عالم کثرت کا ہے منشا واحد  اعضا ہیں جدا جدا مگر جسم ہے ایک

امجد ذیل کی رباعی میں مسئلہ ہمہ اوست کو کس طرح پانی بنا دیتے ہیں دیکھئے۔

واجب سے ظہور شکل انسانی ہے  وحدت میں دوئی کا وہم نادانی ہے
دھوکا ہے نظر کا ورنہ ہر شئے ہمہ اوست  گرداب حباب موج سب پانی ہے

دُنیا کی ہر شئے میں صوفیائے کرام کو خدا کا جلوہ نظر آتا ہے اور ہر قطرہ میں معرفت کے دریا بہتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور ہر درخت کے پتے پتے میں پروردگار کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ اسی خیال کو امجد نے ذیل کی رباعی میں کس خوبی سے پیش کیا ہے دیکھئے۔

ہر قطرہ میں بحرِ معرفت مضمر ہے
ہر اک ذرہ میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے
ہو چشمِ بصیرت تو ہے ہر چیز اچھی
گر آنکھ نہ ہو تو لعل بھی پتھر ہے

دوسری رباعی میں بھی امجد نے اسی خیال کو پیش کیا ہے۔

صنعت تیری ہر خار دکھا دیتا ہے
ہر غنچۂ گل تیری صدا دیتا ہے
ہر اصل اصولِ معرفت ہے یارب
پتہ پتہ تیرا پتا دیتا ہے

ہمہ اوست کے بعد "میں اور تو" کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دراصل یہ ہمہ اوست ہی کی تفسیر ہے۔ امجد نے مختلف رباعیوں میں اس مسئلہ کو نہایت سادہ الفاظ میں حل کیا ہے۔

ہیں مستِ مئے شہود تُو بھی میں بھی
ہیں مدعی نمود تُو بھی میں بھی
یا تُو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں
ممکن نہیں دو وجود تُو بھی میں بھی

بے خود میں رہوں تو وہ قریب آتا ہے
اس پردے میں وہ پردہ نشیں آتا ہے
وہ جب آتا ہے میں نہیں رہتا ہوں
میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

میں قلزمِ ذخّار ہوں منبع تو ہے
میں مہرِ جہانِ تاب ہوں مطلع تو ہے
ہے فرق بہت لطیف ہم دونوں میں
مانندِ ضمیر میں ہوں مرجع تو ہے

امجد اپنے تصوف کے رنگ میں آیاتِ قرآنی کی ایسی تفسیر کرتے ہیں کہ

ان کی ہر رُباعی بجائے خود الہامی نظر آنے لگتی ہے۔

"اذکرونی اذکرکم" ؎

غم سے ترے اپنا دل نہ کیوں شاد کروں　　جب تو سُنتا ہے کیوں نہ فریاد کروں
میں یاد کروں تو، تو مجھے یاد کرے　　تو یاد کرے تو میں نہ کیوں یاد کروں

"وحملها الانسان کانہ ظلوماً جھولا" ؎

اس سینے میں کائنات رکھ لی میں نے　　کیا ذکرِ صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی جاہل سہی نادان سہی　　سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

ایک رباعی میں متصوفانہ مضمون کو عاشقانہ انداز میں کیا خوب لکھا ہے۔

جی اس کا بھی بھر آیا رُلا کر مجھ کو　　ٹھنڈا نہ رہا خود بھی جلا کر مجھ کو
خود مل گیا خاک میں ملا کر مجھ کو　　کیا فتح ہوئی شکست پا کر مجھ کو

آج کل انسان کی مذہب سے لاپروائی ظاہر ہے نہ خوفِ خدا دل میں باقی رہا نہ خوف آخرت۔ جس کے سبب عباداتِ الٰہی مثلاً نماز۔ روزہ زکوٰۃ جیسے عبادات کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی۔ جب خوفِ خدا ہی دل میں نہیں تو عبادت کا کیا مقام۔ انسان احکامِ خداوندی کے خلاف ہر کام کرنے کو تیار مثلاً کھیل کود جیسے لغویات اور سینما بینی وغیرہ جیسے مخرب اخلاق کاموں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ امجد جو شاعر کے ساتھ ساتھ صوفی بھی ہیں مگر اُن صوفیا کی طرح نہیں جو نماز۔ روزہ جیسی اہم عبادات سے خود کو مستثنیٰ سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس امجد خود ان احکام کے سختی سے پابند ہیں۔ کہتے ہیں :-

زنجیر درِ عرش ہلاتا ہوں میں  
آنکھ اس سے نماز میں لڑاتا ہوں میں  
سجدے کے بہانے دل کی بیتابی سے  
قدموں پہ کسی کے لوٹ جاتا ہوں میں

زکوٰۃ اور نماز کی اہمیت کو کس سادگی کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں یہ بتاتے ہوئے کہ سرمایۂ زندگی یہی ہے۔

خالق نے جنھیں دیا ہے زر دیتے ہیں  
زر کیا ہے خدا کی راہ میں گھر دیتے ہیں  
اپنا سرمایہ ہے رکوع و سجدہ  
سامان نہیں رکھتے ہیں سر دیتے ہیں

تمام عبادتوں میں نماز کی اہمیت، افضلیت اور اس کی برتری کو نہایت سادہ الفاظ میں کس قدر دل نشین پیرایہ میں بیان کرتے ہیں دیکھیے

دلبر کے لیے ادائے ناز اچھی ہے  
عاشق کے لیے رسم نیاز اچھی ہے  
موقع ہے یہی تو اک قدم لینے کا  
ہر اک عبادت سے نماز اچھی ہے

دُعا کی فضیلت اور اس کی تمثیل میں جس حکمت کا اظہار فرمایا ہے لاجواب ہے۔

ہر دم اُس کی عنایت تازہ ہے  
اُس کی رحمت بغیر اندازہ ہے  
جتنا ممکن ہو کھٹکھٹائے جاؤ  
یہ دستِ دعا خدا کا دروازہ ہے

خدائے برتر کی ہستی ایسے پردے میں مستور ہے جو سوائے اہلِ باطن کے کسی کو نظر نہیں آتی۔ خانہ کعبہ کا غلاف بھی سیاہ ہے جس کو دیکھ کر امجد اسرارِ الٰہی کے متعلق عجیب کیفیت بیان کرتے ہیں۔

ہے شاہدِ حُسن ہر جگہ پردے میں  
ملتی ہی نہیں کسی کو رہ پردے میں  
اس کا ہر ایک راز کعبے کی طرح  
پردے میں ہے اور وہ بھی سیاہ پردے میں

انسان جب کسی سے ملاقات کرنا چاہتا ہے تو پہلے اس کے گھر کا پتہ معلوم کرتا ہے اور جب پتہ معلوم ہو جاتا ہے تو پھر کبھی نہ کبھی ملاقات ہو ہی جاتی ہے اس لیے خانۂ کعبہ کی زیارت کے بعد امجدؔ نے جو رباعی موزوں کی وہ قابلِ صد تعریف ہے۔

رستہ ترا سر سے طے کیا ہے ہم نے
سب کچھ تری رہ میں دے دیا ہے ہم نے
مل لیں گے کبھی تجھ سے بھی انشاء اللہ
گھر تو ترا دیکھ ہی لیا ہے ہم نے

خدائے تعالیٰ کو پانے کے لیے اکثروں نے کوشش کی لیکن کسی کو بھی اس خالقِ لم یزل کا پتہ نہ چلا۔ مادہ پرست دُنیا بھی سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود خدا کو پانے میں ناکام رہی۔ اہلِ یورپ جس قدر خدا سے بے گانہ اور مادہ پرستی میں مبتلا ہیں وہ ان کے عمل سے بخوبی ظاہر ہے۔ سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود بھی سائنس داں خدا کو پانے میں ناکام ہیں۔ اس امرِ واقعہ کو امجدؔ کی زبان سے سُنئے۔

اس مہرِ جہاں تاب کا ذرّہ نہ ملا
لاکھوں میں کسی ایک کو رستہ نہ ملا
زپلین میں اُڑا ریل میں دوڑا لیکن
بندے کو کہیں پتہ خدا کا نہ ملا

آج کل مسلمانوں کے حال و قال میں اور قول و عمل میں جو بعد المشرقین ہے اس سے ہر ایک بخوبی واقف ہے۔ کہنے کو نام کے مسلمان ہیں لیکن عمل غیر مسلموں سے بھی بدتر جس کی وجہ سے ہر جگہ ذلیل و خوار ہیں۔ مسلمانوں کی اس تباہی و بربادی کا نقشہ امجدؔ نے جس پیرایہ میں کھینچا ہے حقیقت پر مبنی ہے۔

دل ہے سینے میں دل میں ایماں نہیں
کہنے کو تو زندہ ہیں مگر جان نہیں
سب کہتے ہیں دنیا میں مسلماں ہیں نثارؔ
ہم کہتے ہیں دنیا میں مسلمان نہیں

امجدؔ تصوف کے اثر سے کثرت میں وحدت کی جلوہ آرائی دیکھتے ہیں۔

ذرّے ذرّے میں ہے خدائی دیکھو
ہر بُت میں ہے شانِ کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم
ہر ایک میں ہے مگر اکائی دیکھو

تصوف میں جب تک کہ ساری دُنیا سے ہاتھ نہ دھویا جائے مقصدِ اعلیٰ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ایک کے ہو جانا ضروری ہے۔ ذیل کی رباعی میں امجدؔ نے اس کو جس خوبی سے بیان کیا ہے قابلِ غور ہے۔

ساری دُنیا سے ہاتھ دھو کر دیکھو
جو کچھ بھی رہا سہا ہے کھو کر دیکھو
سب کچھ نہ ملے اگر تو میرا ذمّہ
اک مرتبہ تم ایک کے ہو کر دیکھو

امجدؔ نے بدی اور توبہ کے فلسفے کو جس خوبی سے سلجھایا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ چونکہ انسان کسی نہ کسی مذہب کا پیرو ضرور ہوتا ہے اور اس کے باوجود اس سے گناہ ضرور سرزد ہوتے ہیں اور وہ اس طرح برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بدی انسان کی سرشت میں ہے۔ پھر اسی کے ساتھ امجدؔ رحمت کے ہمہ گیر فلسفہ کو پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انسان سے بدی اگر سرزد ہوتی ہے تو اس کے لیے ہمیشہ توبہ و استغفار کے دروازے کھلے رہتے ہیں کیونکہ رحمتِ خداوندی عام ہے، یہ انسان پر منحصر ہے کہ جیسے ہی اس سے بدی سرزد

ہو فوراً توبہ کرلے۔

رحمت منڈلا رہی ہے پیچھے پیچھے  اک بدلی سی چھا رہی ہے پیچھے پیچھے
اے میری بدی، ٹھیر، کہاں جاتی ہے  توبہ بھی تو آ رہی ہے پیچھے پیچھے

اس رباعی میں رحمتِ خداوندی سے پُر امید ہو کر امجدؔ بدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں اے میری بدی تو کہاں جا رہی ہے ٹھیر اور جا کر تجھے کرنا بھی کیا ہے جب کہ توبہ تیرے پیچھے ہی آ رہی ہے گو توبہ کے ساتھ ہی بدی، بدی نہیں رہتی بلکہ بدی کے دھبّے دامن سے دُھل جاتے ہیں۔

آج مسلمان جس شرک اور بُت پرستی میں مبتلا ہے اُس کا اندازہ بیان سے باہر ہے چنانچہ امجدؔ نے اپنی رباعی میں شرک اور بُت پرستی کی کس قدر سچی تصویر کھینچی ہے۔ قابلِ غور ہے۔ اس لیے کہ مسلمان نے آج خدا سے اپنے رشتے کو توڑ کر مُردوں اور پیروں سے اپنی نسبتوں کو جوڑ رکھا ہے اس لیے امجدؔ نے مسلمان کی اس حالت کا نقشہ سیدھے سادے الفاظ میں اس طرح کھینچا ہے کہ اس کی زندگی فوراً نظروں کے سامنے آجاتی ہے

درگاہوں پر رکوع و سجدہ دیکھا  قبروں کا نشان عرش سے اونچا دیکھا
مُردہ در دستِ زندہ سنتے تھے مگر  زندوں کو بھی بدستِ مُردہ دیکھا

امجدؔ نے رباعیات حصہ سوم میں جو حال حال میں شائع ہوئی ہے "کھانا اور کھِلانا" پر ایک رباعی لکھی ہے جس سے کامیاب زندگی کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے اِنسان کو جس بات کا خیال

رکھنا چاہئے وہ صرف یہ ہے کہ اس کے پیشِ نظر ہمیشہ یہ بات رہے کہ وہ کیا کھا رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ دونوں کا تعلق زبان سے ہے۔ کھانا حلال و حرام غذا سے متعلق ہے اور کہنے کا تعلق انسانی قلوب سے ہے۔ اگر انسان حلال روزی کھائے اور کسی کے دل کو نہ دُکھائے تو بس یہی حاصلِ زندگی ہے۔ رباعی ذیل میں درج ہے:۔

یہ دو باتیں شام و سحر یاد رکھئے | میں کیا کھا رہا ہوں میں کیا کہہ رہا ہوں
اسی میں ہے سارا اثر یاد رکھئے | میں کیا کھا رہا ہوں میں کیا کہہ رہا ہوں

اسی حصہ سوم کی ایک اور رباعی "کام کی بات" بہت خوب ہے جس میں امجدؔ نے اس نظریہ انسانیت کو پیش کیا ہے جو ہمدردیٔ انسان سے متعلق ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ کوئی کون ہے۔ کیا ہے۔ مُسلم ہے یا کافر۔ مطلب تو صرف اس بات سے ہے کہ وہ انسان ہے۔ بہ لحاظ انسان کے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ انسانی فلاح و بہبود اور ہمدردی ہی شیوۂ انسانیت ہے۔ گویا دوسروں کے کام آنا ہی عین زندگی۔

میاں امجدؔ تمہاری جیسی مرضی
بنو کافر کہ تم اسلام لاؤ
مگر کہہ دیتے ہیں اک کام کی بات
جہاں تک ہو کسی کے کام آؤ

بظاہر مذہب اور شاعری دو متضاد چیزیں ہیں لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے شاعری کبھی کبھی پیغمبری کا فرض بھی انجام دیتی ہے امجدؔ کی

شاعری اس حیثیت سے پیغمبری کا جزو ہے۔

دارو ئے لطیف در دہن می ریزم
من آبِ حیات در چمن می ریزم

گویم بہ زبان حادث اسرارِ قدم
در ساغرِ نو مئے کہن می ریزم

امجد کے نزدیک مذہب دینی پیشواؤں کے حرص و آز اور فرقہ بندی و فرقہ پرستی سے بلند و بالا ہے۔ کہتے ہیں۔

چھا رہی ہے سیاہی اعمال
شامِ اسلام کی سحر کیا ہو

ہر مبلغ ہے فکرِ مبلغ میں
ایسی تبلیغ کا اثر کیا ہو

امجد وہ شخص ہیں جنھوں نے زاہدوں اور واعظوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ ریاکاری کی دقیق اور باریک کارسازیوں کی قلعی کھولی ہے۔ امجد کے صاف صاف اور کھلے کھلے لفظوں میں چھپی اور چبھتی ہوئی چوٹیں ہیں جن سے ریاکاروں کے دل بھی برما جائیں۔

دینداری کا اوڑھ کر برقعہ
دین کا کام ہی تمام کیا

شیخ نے دوستوں کی صورت میں
دشمنوں سے زیادہ کام کیا

آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے سے متعلق اور شاعروں نے بھی طبع آزمائی کی ہے مگر اس ضمن میں امجد کی ذیل کی رباعی ملاحظہ ہو۔

رُخ مہر ہے قد خطِ شعاعی کی طرح
ہے گلۂ امت میں وہ راعی کی طرح

اس خاتمِ انبیاء کا آخر میں ظہور
ہے مصرعہ آخر رباعی کی طرح

---

# امجد کی شاعری کی اصناف

امجد کا کلام نظم، تضمین، غزل، رباعی، قطعہ اور مستزاد سب ہی اصناف پر مشتمل ہے۔

**نظمیں** امجد نے نظمیں مختلف موضوعات پر لکھی ہیں موضوع کے لحاظ سے ہم اس کو واقعہ نگاری، وصف نگاری، اخلاقی، صوفیانہ اور اصلاحی کے عنوانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

**واقعہ نگاری** کسی اہم یا تاریخی واقعہ کو بے کم و کاست نظم کرنے کو واقعہ نگاری کہتے ہیں۔ اس کے لئے زبان پر قدرت ضروری ہے۔ جس واقعہ کو عام آدمی غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں شاعر اسی واقعہ کو لے کر ادب اور صناعی کی ایک پوری کائنات تخلیق کر ڈالتا ہے۔ وہ واقعات کی تہہ میں کام کرنے والے تاریخی اور سماجی اسباب و علل کی کنہہ تک آسانی کے ساتھ پہنچ جاتا ہے جہاں تک عام آدمی کی رسائی ممکن نہیں۔ واقعہ نگاری کے لئے صرف ~~زبان پر قدرت کافی نہیں ہے بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا بھی ضروری ہے~~ تاکہ جب کبھی شاعر کسی واقعہ کو بیان کرنا چاہے تو اس کی نظر ان تمام جزئی حالات اور کیفیات پر رہے جو اس واقعہ میں پیش آتے ہیں۔

واقعہ نگاری جب کمال کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے تو اس کو موقع نگاری کہا جاتا ہے۔ اس میں کسی چیز کا سماں یا سین کھینچا جاتا ہے۔ واقعہ نگاری میں معصومانہ فطرت کی سچی تصویریں اس طرح کھینچی جاتی ہیں کہ الفاظ گویا ایک

نظم ہیں جو نظارہ پیش کرتے ہیں۔ یہی واقعہ نگاری ہے اور اسی کا نام شاعری۔ گویا واقعہ نگاری سے وہ کلام مراد ہے جس میں کسی واقعہ کا ذکر ہو۔

رابرٹ ایلیس کا خیال ہے کہ "جو کچھ دنیا میں ہوسکتا ہے بیان کیا جاسکتا ہے۔ ضرورت ایسے آدمی کی ہے جو اس کو بیان کر سکے"

رابرٹ ایلیس کے اس خیال سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ہوسکتا ہے اس کو ہر آدمی بیان نہیں کر سکتا بلکہ اس کے لئے ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو واقعات کے پیچھے ڈھکی چھپی تحریکات کی روح تک پہنچ سکے اور اس کو بے افگندۂ نقاب کر سکے۔

ملاحظہ کیجئے :۔

وہ رات کا سناٹا وہ گھنگور گھٹائیں　　بارش کی لگا تار جھڑی سرد ہوائیں
گرنا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں　　وہ مانگنا ہر اک کا رو رو کے دعائیں
پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی
پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی

کیا اس سے واقعہ کی سچی تصویر آنکھوں کے سامنے نہیں آجاتی

وہ بوٹا سا قد اور وہ چکنے ہوئے رخسار　　وہ چاند سی پیشانی تیری مطلع الانوار
وہ ابروئے خمدار تری ننھی سی تلوار　　وہ آنکھیں جنھیں دیکھ کے دشمن بھی کریں پیار
تیغ اجل اک آن میں تڑپا گئی تجھ کو
اے نور نظر کس کی نظر کھا گئی تجھ کو

اظہار واقعہ کے ساتھ ساتھ شاعر کے جذبات کی کس قدر سچی تصویر ہے

الفاظ کا انتخاب اور ان کی معیّن ترتیب، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خیال اور الفاظ ایک دوسرے میں اپنی انفرادیت کھو بیٹھے ہیں۔ لفظ سے خیال اور خیال سے لفظ کی تخلیق کی اس سے بہتر مثال سوائے اقبال کے کسی اور کے ہاں ممکن نہیں۔

**واقعہ نگاری کی مثال** | قیامت صغریٰ۔ قتیل جفا اسنو ہلتا۔ ایک بیکس کا خواب۔ یہ واقعہ نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔

قیامت صغریٰ والی نظم میں "طغیانی رود موسیٰ" کے دردانگیز واقعہ کو نہایت اچھے پیرایہ میں نظم کیا گیا ہے۔ "اسنوھلتا" بنگال کی ایک خاتون کی آتشزدگی سے متعلق ہے یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے جو بنگال میں ہوا شادی کے موقعہ پر دولہا والوں کو جو بڑی بڑی رقمیں لڑکی والوں کی جانب سے دی جاتی ہیں اس سے متعلق ہے۔ دولہا والوں نے جب اسنوھلتا کے والدین سے رقمی مطالبہ کیا تو اسنوھلتا نے یہ دیکھکر کہ اس کے ماں باپ بہت غریب ہیں اور وہ دولہا والوں کے مطالبات کی تکمیل نہیں کرسکتے تو اس فکر اور پریشانی سے والدین کو نجات دلانے کیلئے ایک دن اپنے آپ کو جلا کر خاتمہ کرلیا۔ طغیانی رود موسیٰ ۳۲۶؁ پر لکھی ہوئی قیامت صغریٰ والی نظم سے مختصر اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

میں مورد حرمان و گرفتار بلا ہوں  
ماں باپ سے بچھڑا ہوا بچوں سے جدا ہوں  
گہ محو فغاں ہوں کبھی مصروف بکا ہوں  
معلوم نہیں خود مجھے میں کون ہوں کیا ہوں  
بیہوش کبھی ہوں کبھی ہوجاتا ہے سکتا

## وہ عالمِ حیرت ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا

---

تاریکی میں دریا نے اک اندھیر مچایا — سیلابِ فنا بن کے کیا سب کا صفایا
پاؤں سے گزرتا ہوا پھر سینہ تک آیا — آگے جو بڑھا موت نے بس حلق دبایا
شب بھر رہے سب پانی میں فوارے کے مانند
ہوتے ہی سحر ڈوب گئے تارے کے مانند
مادر کہیں اور بہن کہیں بادیدۂ پرنم — بی بی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم
عالم میں نظر آتا تھا تاریکی کا عالم — کیوں رات نہ ہو ڈوب گیا نیرّ اعظم
سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے
وہ غم تھا کہ دن کو نظر آنے لگے تارے

---

اے موسیٔ فرعون صفت! کچھ تو کرم کر — اے موج ذرا دیکھ، میری حالتِ مضطر
ہاں اے لبِ ساحل نہ رکھ اب مجھ کو مکدر — کہہ دے کہ کہاں ہے میرا کھویا ہوا گوہر
ہاں اے صدفِ صاف خدا کیلئے منہہ کھول
چپ کیوں ہے تو اے ماہیٔ سر بزدہ کچھ بول
خاموش تو کس واسطے اے برقِ تپاں ہے — آخر تیرے منہہ میں بھی تو اے رعد زباں ہے
اے مہرِ جہاں تاب! مرا چاند کہاں ہے — کس چاہ میں وہ یوسفِ گم گشتہ کہاں ہے
اے قافلۂ ریگِ رواں تو ہی بتا دے
کس جا ہے میری مادرِ مرحومہ بتا دے

جب انجمنِ عیش و طرب ہو گئی برباد — افسردہ بھلا کیوں نہ رہے خاطرِ ناشاد
تنہائی میں آتی ہے عزیزوں کی اگر یاد — بے ساختہ کرتا ہے دلِ غم زدہ فریاد
اشک آنکھوں سے جاری ہیں کبھی لب پہ فغاں ہے
مرنے کے لئے مرتے ہیں پر موت کہاں ہے

اس نظم کی تاثیر کو ملاحظہ کیجئے۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کے ایک دوست نے اس نظم کو پڑھنے کے بعد کہا تھا کہ جب وہ نظم پڑھ رہے تھے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ موسلا دھار مینہ برس رہا ہے۔ مکانات گر رہے ہیں۔ ندی زور و شور سے بہہ رہی ہے۔ غضب یہ کہ ندی میں ان کی بچی بھی بہی چلی جا رہی ہے۔ کھلی آنکھوں سے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ زبان بند ہو گئی ہے نہ کسی کو بلا سکتے ہیں نہ پکار سکتے ہیں نہ کتاب ہاتھ سے چھوٹتی ہے۔ بہرحال عجیب مخمصہ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب کیفیت خود بخود رفع ہو گئی۔ دماغ اس عالم کی طرف پلٹا۔ کتاب ہاتھ سے پٹک فوراً بچی کی طرف لپکے بچی کو بستر پہ آرام سے سوتا پایا۔ پھر بھی یقین نہ آیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ بچی زندہ ہے یا مر گئی۔ آخر بچی کو جگایا جب وہ جاگ اٹھی پیار کر کے گلے سے لگا کے پھر سلا دیا۔ جان میں جان آئی۔ اس نظم کو پھر دوبارہ پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ (جمالِ امجد صفحہ ۱۰۱)

**وصف نگاری**

وصف نگاری سے مراد مناظرِ قدرت پر اظہارِ خیال ہے جس سے انسانی جذبات متاثر ہوتے ہیں۔ وصف نگاری میں ان چیزوں کو داخل کیا جاتا ہے جن کے لئے جذبات کی تحریک

ضروری نہیں بلکہ موجودات کی حقیقت اور حال کا نقشہ کھینچا جاتا ہے جس سے ان کے اوصاف واضح اور نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

امجد کی وصف نگاری کی نظموں سے یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ امجد نے کس خوبی سے وصف نگاری کا حق ادا کیا ہے۔

وصف نگاری کے نمونے

وصف نگاری کی نظموں میں میری قمری یتیم لڑکی کی دعا اور بت ہم برہمن ہم۔ ماں اور بچی خاص ہیں۔ بخوف طوالت چند اقتباسات نمونتاً پیش ہیں۔

## میری قمری

ہم نے قمری عجیب پالی ہے — مظہر نغمۂ بلالی ہے
کیا ہی نازوں سے اسکو پالا ہے — قفس نقرئی میں ڈالا ہے
قمریاں یوں تو دیکھی بھالی ہیں — اس کی باتیں مگر نرالی ہیں
گیت توحید کے سناتی ہے — راہِ حق کی طرف بلاتی ہے
ہے صدا اس کی مونسِ دل زار — جس پہ قرباں ہزار صوت ہزار

ہے غضب اس کی مست کن آواز
گویا باب سماع ہو گیا باز

# یتیم لڑکی کی دعا

ظالم اجل نے بالکل تاراج کر دیا گھر	سب چل بسے عدم کو اب باپ ہیں نہ مادر
اب پیار کرنیوالا کوئی نہیں ہے دم بھر	آنکھیں لگی ہیں میری مالک ترے کرم پر

ماں باپ سے ملادے او آسمان والے

ماتم میں ہمدموں کے دم اپنا توڑتی ہوں	دنیا نے مجھ کو چھوڑا میں اسکو چھوڑتی ہوں
بابِ کرم پہ تیرے سر اپنا پھوڑتی ہوں	منت سے تیرے آگے اب ہاتھ جوڑتی ہوں

ماں باپ سے ملادے او آسمان والے

# بُت ہم برہمن ہم

کریں کس کی محبت میں عبث فریاد و شیون ہم
پھریں آوارہ ہو کر کس کی خاطر کوئی و برزن ہم
ادب سے سامنے کس کے جھکائیں اپنی گردن ہم
کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چندن ہم
صنم ہم دیر ہم بُت خانہ ہم بُت ہم برہمن ہم

سوا اپنے نہیں ہم چشم کوئی اپنا بیگانہ
خدا کی شان اب تو جامِ جم ہے چشمِ مستانہ
جدھر دیکھو نظر آتا ہے ہر سو روئے جانانہ
در و دیوار ہے نظروں میں اپنے آئینہ خانہ

کیا کرتے ہیں گھر بیٹھے ہوئے آپ اپنا درشن ہم

نہ فکرِ دین و دنیا ہے نہ کچھ اعمال سے مطلب
غرض کوئی گزشتہ سے نہ استقبال سے مطلب
نہ حجت سے ہے دلچسپی نہ استدلال سے مطلب
نہ قیل و قال سے مطلب نہ شغل اشغال سے مطلب
مراقب اپنے رہتے ہیں جھکا کر اپنی گردن ہم

کسی کے عشق میں سنتے ہیں طعنے دوست دشمن کے
گریباں چاک ٹکڑے آستیں پرزے ہیں دامن کے
گرے ہیں اشک آسا بیٹھے ہیں نقش قدم بن کے
کبھی اٹھتے ہیں اٹھائے سے کسی شیخ و برہمن کے
درِ دلبر پہ اپنے مار کر بیٹھے ہیں آسن ہم

جنہیں ڈھونڈا کیا دیر و حرم میں دلنشیں تھے وہ
سمجھتے تھے جنہیں ہم دور اے امجد قریں تھے وہ
جہاں کی خاک چھانی عشق میں جن کے یہیں تھے وہ
ہوا اے فیض معلوم ایک مدت میں ہمیں تھے وہ
جپا کرتے ہیں جن کے نام کی دن رات سمرن ہم

(ریاض امجد حصہ اول ص۲۵)

اخلاقی نظمیں

ایسی نظموں کے ذریعہ شاعر دنیا کو اخلاق کی تعلیم دیتا ہے مذہبی گتھیوں کو سلجھاتا اور فلسفیانہ خیالات کو

حل کرتا ہے۔ مذہبی اور صوفیانہ شاعری اسی کی قسم ہے۔ اخلاقی نظموں کے ذریعہ شاعر انسانوں کو زیور انسانیت سے آراستہ کرتا ہے۔ اس طرح شاعر معلم اخلاق کا کام کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ اخلاق کے مختلف پہلوؤں صبر و قناعت۔ محنت و مشقت۔ زہد و توکل اور اتحاد و اتفاق ہمت و استقلال کی تعلیم دیتا ہے۔ اردو میں بہت سے شعرا پیدا ہوئے جنھوں نے اخلاق کی تعلیم دی لیکن امجد ان سب میں منفرد ہیں۔

تعمیر اخلاق امجد کا خاص موضوع ہے۔ اخلاق پر رباعیات کے سوا امجد نے نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں سے بعض یہہ ہیں :-

حاجت بسیار نیست - خموشی معنی دارد

## حاجت بسیار نیست

مبتلائے حرص بیجا آج خاص و عام ہے
فکر جمع مال و زر کمبخت صبح و شام ہے
مفت بیچاری ضرورت ہر جگہ بدنام ہے
ابن آدم اپنے ہاتھوں مورد آلام ہے

در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست
آنچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست

اب برق چاہئے نازوں کے پالے کیلئے
بیکسوں کو چاندنی بس ہے اُجالے کیلئے
کلی والوم رہے ہو کیوں دوشالے کیلئے
ہے یہ کچھ وہ بھی بہت مرنے والے کیلئے

در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست
آنچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست

## صوفیانہ نظمیں

اخلاقی نظموں کی طرح صوفیانہ نظمیں امجد کے ہاں خاص رنگ کی ہیں تصوف امجد کا خاص اور پسندیدہ موضوع ہے۔

اسلامی تصوف کا سرچشمہ قرآن مجید ہے جس میں خدا کے وجدانی علم اور خدا اور انسان کے ازلی تعلق کی طرف متعدد بار اشارہ کیا گیا ہے "ہم خدا کے ہیں اور ہمیں خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے"۔ تصوف میں سالک طریقت کے راستہ پر چلتا ہے اور ان دشوار گزار مقامات سے جو اس راہ میں واقع ہیں گزرتا ہوا بالآخر فنا فی الحق ہو جاتا ہے۔ یہ ہے اس زندگی کا منتہائے کمال۔ یہ ہے اس کی سب سے بڑی خوشی اور اسی کے حصول میں وہ دنیا کی ساری تکلیفیں اٹھاتا اور اپنی زندگی کی ساری خوشیاں قربان کر دیتا ہے۔

طریقت کے بعض مقامات یہ ہیں۔ توبہ۔ زہد۔ فقر۔ صبر۔ توکل "مقامات" ریاضت و مجاہدہ سے طے ہوتے ہیں لیکن "احوال" جو قلبی اور روحانی حالتیں ہیں محض خدا کی خوشنودی سے ہیں۔ احوال میں سے بعض یہ ہیں۔ مراقبہ۔ قرب الٰہی۔ عشق۔ سکون و اطمینان۔

ان مقامات کو ایک صوفی منش نے اس طرح بیان کیا ہے کہ پہلے طالب حقیقت عالم ناسوت میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ وہ شریعت کے مطابق عمل کرتا ہے اور تمام شرعی احکام و رسوم کا پابند رہتا ہے پھر اس کا گزر عالم ملکوت میں سے ہوتا ہے اور یہاں وہ طریقت کے

راستہ پر چلتا ہے پھر وہ عالم جبروت کا مقام طے کرتا ہے اور یہاں وہ معرفت کو اپنا رہبر بناتا ہے۔ سب سے آخر میں وہ عالم لاہوت میں پہنچتا ہے جہاں وہ حقیقت کی اعانت سے فنا فی الحق ہو جاتا ہے۔

صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ کائنات میں صرف خدا کی ذات موجود ہے وہ سب اشیا میں ہے اور سب اشیا اس میں ہیں۔ ہمہ اوست اور ہمہ از وست۔ یہی تصوف کے بڑے مسائل ہیں۔ تمام مرئی اور غیر مرئی اشیا کا سرچشمہ خدا ہے اور اس سے علیحدہ ان کی کچھ ہستی نہیں۔ مذاہب کی کچھ اہمیت نہیں بجز اس کے کہ وہ حقائق سمجھنے میں کچھ مدد دیتے ہیں۔ ان میں بعض دوسروں سے بہتر ہیں۔ مثلاً اسلام۔ جس کا صحیح فلسفہ تصوف ہے۔ خدا نوع انسان کے افعال کا منبع ہے۔ خدا ہی انسان کے ارادے کو قائم کرتا ہے اس لئے انسان اپنے عمل میں ایک حد تک مجبور ہے روح جسم سے پہلے موجود تھی اور جب تک انسان زندہ رہتا ہے وہ اس قفس میں مقید رہتی ہے لہذا واصل حق ہونا ہر صوفی کا نصب العین ہونا چاہیئے تاکہ وہ جس قدر ممکن ہو خدا سے مل جائے۔

ایک صوفی کا اصلی کام وحدانیت پر غور و فکر کرنا اور طریقت سے گزر کر خدائے لایزال سے متحد ہو جانا ہے نفس کشی زندگی کا بڑا مرحلہ ہے جب انفرادی ہستی مٹ جاتی ہے تو ہمہ گیر ہستی کا جز بن جاتی ہے۔ "اپنے دل میں دیکھو کہ خدا کی خدائی وہاں پر تو افگن ہے"۔ کائنات حقیقی وجود کی ظاہری و مرئی شکل ہے اور حقیقی وجود ہی کائنات کی

باطنی و غیر مرئی حقیقت ہے" انسان کائنات کا سرتاج اور اس کی علت غائی ہے۔ شر یا برائی کی یہ وجہ ہے کہ بغیر برائی کے اس نیکی کا پالینا جو نفس کشی کا جز رہے ناممکن ہے۔ مولانا روم کا عقیدہ ہے کہ کائنات میں کوئی شئے قطعی بری نہیں بری اشیاء میں بھی نیکی کی روح دیکھنا چاہو تو عشق اور اس کے حقیقی علم کی عینک لگا کر دیکھو۔ عشق حقیقی کی رنگینیوں سے صوفیانہ شاعری کی فضا لبریز و رقت انگیز ہے اور ان کی دنیا میں" من تو شدم تو من شدی کی ہزاروں مست و شیریں صداؤں سے روز و شب' معرفت و حقیقت کی دلگداز گونج پیدا ہوتی رہتی ہے۔

**صوفیانہ نظم کے نمونے** | صدائے درویش۔ دربار خواجہ۔ جوش رحمت فریاد مجنوں۔ دنیا اور انسان۔ تو پی کہے سو کون۔ عاشق کا جنازہ۔ کوئلہ بھئی نہ راکھ۔ حکایت و شکایت۔ سبحان ربی الاعلیٰ۔ ولارطب ولا یابس۔ میرا رام کہاں ہے۔ مکالمہ جان و تن۔ قل متاع الدنیا قلیل۔ یہ آخر کون ہے۔ سائیں بابا۔ میرا مکان۔ عشق و مذہب۔ الفقر فخری۔ صوفیانہ نظمیں ہیں۔

## جوشِ رحمت

دعا کوئی بیکار جاتی نہیں یہاں ناامیدی سماتی نہیں
بلاتی ہے آ تجھکو رحمت میری نہ جائیگی خالی عبادت تیری

قبول است گرچہ ہنر نیستش
کہ جز ما پناہے دیگر نیستش

## فریادِ مجنوں

وصلِ لیلیٰ سے مجھے گر یاس ہے
غم نہ کر رب تیرا تیرے پاس ہے
رہتے ہیں ہر وقت ہم تیرے قریں
سنتے ہیں ہم تیری آوازِ حزیں
ہے اثر تیرے دلِ ناشاد میں
لطف ملتا ہے تیری فریاد میں

خوش نماید نالۂ شب ہائے تو
ذوق ہا دارم بہ یارب ہائے تو

## تو پی کہے سو کون

پپیہے او پپیہے! تو یہ کیوں آنسو بہاتا ہے
زباں پر تیری پی پی کس لئے رہ رہ کے آتا ہے
ارے درد و غم کیوں درد مندوں کو سناتا ہے
جو خود ہی جل رہا ہو اور کیوں اسکو جلاتا ہے

~~کاٹوں تیری چونچ پپیہے ڈاروں وا پہ لون~~

میں پی کی اور پی مورا تو پی کہے سو کون

ارے جز آہ و نالہ دوسرا کوئی نہ کام آیا
خدا کو مان ظالم اب تو چپ ہو وقت شام آیا
آواز کیا آئی اجل کا اک پیام آیا
خبردار اب اگر تیری زباں پر پی کا نام آیا

کاٹوں تیری چونچ پپیہے ڈاروں وا پہ لون
میں پی کی اور پی مورا تو پی کہے سو کون

نہ کراب امجد خستہ کو ظالم چیخ کر مضطر     برنگ و بوئے گل نادان جامے سے نہ ہو باہر
اری ننھی سی چڑیا، جان ننھی سی زبان گز بھر     چڑھا دیگا کوئی منصور کے مانند سولی پر

کاٹوں توری چونچ پپیہے ڈارون وا پر نون
میں پی کی اور پی مورا تو پی کہے سو کون

---

## دنیا اور انسان

(قاعتبزوایا اولی الابصار)

ایک مسافر کسی جنگل سے چلا جاتا تھا
ناگہاں راہ میں ایک شیر زیاں کو دیکھا
چڑھ گیا ایک شجر پر وہیں وہ خوف زدہ
شیر نے دیکھا کہ ہاتھوں سے شکار آ کے گیا

ہونٹ چباتے کبھی غصے سے دھڑو کے مارے
رنج و غم سے نظر آنے لگے دن کو تارے

---

اب سنو غور سے اے مال پہ مرنے والو     پاک ناپاک سے اس پیٹ کے بھرنے والو
ساحل عمر دو روزہ پہ اترنے والو     اپنے اعمال کی شامت سے نہ ڈرنے والو
اپنا بیتی ہے یہ سب غیر کا افسانہ نہیں
قصہ حمزہ نہیں حالت بیگانہ نہیں

# میرا رام کہاں ہے

رات جب لوگ سوتے تھے سارے — چپ کھڑی تھی میں گنگا کنارے
چاند پانی میں تھا عکس افگن — مائی گنگا کا پُر نور جوبن
دیکھ کر ایسا دلکش نظارا — شدتِ غم سے میں نے پکارا
روح بسمل ہے جاں نیم جاں ہے
ہیں یہاں رام میرا کہاں ہے

---

کوئی بیکس کا رہبر نہیں ہے — مہرباں کوئی مجھ پر نہیں ہے
لاکھ رُو رُو کے میں نے پکارا — محوِ غفلت ہے سنسار سارا
یاس کی اوس برسی جو دل پر — دی صدا رعد نے یہ گرج کر
دیکھ ہے پرمیشر مجھ میں تجھ میں — رام تجھ میں ہے۔ ہے رام مجھ میں
رام ہے جان میں رام تن میں — رام گلشن میں ہے رام بن میں
رام کا ذکر کرنا ہر نام تیرا ہے — رام سب میں ہے سب رام میں ہے
وہ تو موجود بد و نیک میں ہے — شان اُس ہر کی ہر اک میں ہے
دل کے ہمراہ دلارام بھی ہے — تو جہاں ہے وہاں رام بھی ہے
کس لئے پھر یہ شور و فغاں ہے
ہیں یہاں رام میرا کہاں ہے

**تضمین** امجد کی تضمین بھی بڑی زوردار ہوتی ہے، فارسی، عربی اور اردو کی بعض غزلوں اور نظموں کی انھوں نے جو تضمینیں کی ہیں وہ اپنی جگہ بہترین نظموں کے برابر ہیں اور اردو فارسی کی عمدہ تضمینوں سے کسی طرح کم نہیں۔ چند نمونے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

**تضمین کے نمونے** دوسرے شعرا کے کلام پر مصرعے لگانے کو تضمین کہتے ہیں یہہ ضروری نہیں کہ جس زبان کی غزل ہو اسی میں مصرعے لگائے جائیں بلکہ عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ بھی مصرعے لگا کر تضمین کی جا سکتی ہے۔ اردو شعرا نے اس طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ ریاض امجد حصہ اول اور حصہ دوم میں اکثر تضمینیں ہیں جو عربی۔ فارسی اور اردو پر مشتمل ہیں۔ جن کے چند نمونے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

رحمت حق ہے عالم میں ساری چشمہ فیض ہو جائے جاری
سب اسی کے ہیں نوری و ناری مہربان سب پہ ہے رب باری
فرق اس میں نہیں ہے سرمو

---

اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرُ الرَّحِیْم

دل کے آئینہ میں دیکھ دم بھر کیوں پریشان ہوتا ہے دردر
خود تیرے پر میں ہے تیرا دلبر دیکھ تو سر کو سجدے میں رکھکر
وجد میں بول اٹھے گا خود تو
اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ

حافظ کی بعض مشہور غزلوں پر امجد نے تضمین کی ہے اس سے
شیراز کی شراب دکن کے رنگین جام میں دو آتشہ نظر آتی ہے۔ ایک
غزل پر تضمین کرتے ہوئے اس بات کو واضح کیا ہے کہ عشق ایک
ایسا راز ہے جو پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا ہے بلکہ کبھی نہ کبھی دن ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔

چھپایا لاکھ مگر چھپ سکا نہ عشق کا راز — تمام حالت دل تاڑ ہی گئے دمساز
تری خطا نہ مرا جرم ہے بہت طنّاز — ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غمّاز
وگرنہ عاشق و معشوق راز دارانند

ہے چاک دل کی طرح زندگی کا پیراہن — مثال نقش قدم آہ پائمال ہے تن
وطن ہے دور یہاں ہمت راہ میں رہزن — تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من
پیادہ میروم و همرهان سوارانند

کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

تھے کیسے کیسے لوگ زمانہ میں سربلند — رکتا نہ تھا غرور کا جن کے کہیں سمند
شاہانِ سرفراز و سلاطین خود پسند — بس نامور بزیر زمین دفن کردہ اند
کز ہستیش بروئے زمین یک نشاں نماند

---

فیض حیدرآباد کے ایک صوفی بزرگ اور اپنے زمانہ کے بڑے
شاعر گذرے ہیں۔ ان کی مشہور غزل "بت ہم پہ یہاں ہم پہ"
امجد نے تضمین کی ہے۔ جس میں تصوف کے پہلو پر روشنی ڈالتے
ہوئے بتایا ہے کہ خدا کو ہم دیر و حرم میں تلاش کرتے ہیں لیکن
دراصل وہ خود ہمارے دل میں ہے۔

جنہیں ڈھونڈا کیا دیر و حرم میں دلنشیں تھے وہ
سمجھتے تھے جنہیں ہم دور اے امجد قریں تھے وہ
یہاں کی خاک چھانی عشق میں جن کے یہیں تھے وہ
ہوا اب یہ ہمیں معلوم اک مدت میں یہیں تھے وہ
جپا کرتے ہیں جن کے نام کی دن رات سمرن ہم

---

محسن کاکوروی اردو کے مشہور نعت گو ہیں ان کے ایک نعتیہ قصیدہ
پڑھیں کا قافیہ بہت مشکل ہے امجد کی نظمیں دیکھئے۔
دو عالم میں ہے اک شہرہ ترے حسن محمد کا
خدائے دو جہاں کرتا ہے نظارہ ترے قد کا
شجر آب و گل سے ہے ہیولا ذات ارشد کا
محمد مصطفیٰ پتلا ہے تو نور مجسد کا
ہوا خورشید اقلیم عدم سایہ ترے قد کا

---

رہا مصروف فطرت رات دن نعت پیمبر میں
اسی سرکار کی الفت کا شفاعت ہے مرے سر میں
بھلا اتنی تو عزت ہو مری درگاہ داور میں
ترے دیکھ کر مجھ کو کہیں دیوان محشر میں
جگہ خالی کرو مداح آتا ہے محمد کا

ایک اور تضمین پیش ہے جو "مازاغ البصر" کے عنوان سے ہے۔

تری آنکھوں میں لکھا ہے کحل مازاغ البصر
میں ہوں اُن آنکھوں کے قربان ہاں ادھر بھی اک نظر
کیا بتاؤں ہائے ان نیچی نگاہوں کا اثر
آمجد ستم رسیدہ ایک جامی تیر خوردہ در جگر

او نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے

---

"کوئلہ بھئی نہ راکھ" میرا بائی کی نظم ہے اس پر آمجد کی تضمین قابل غور ہے جس میں مضمون کو نہایت بہتر طریقہ پر سمجھایا گیا ہے۔

کوئلہ بھئی نہ راکھ

نکھلنے پائے اک دن دیدہ عبرت نما میرے
جوانی جا چکی اب ہو بہ پیری ہیں قوی میرے
نہ سمجھا آج تک میں کیوں اپنا ہوں ایجزا میرے
جہاں کا ذرہ ذرہ کار آمد ہے سوا میرے
لکڑی جل کوئلہ بھئے اور کوئلہ جل بھئے راکھ
میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

اے تیرگی شب سے ہو تو سحر پیدا
فروغ صبح مٹ جائے تو ہوں انوار خود پیدا

بدل جائے اگر قطرہ کی حالت ہو گہر پیدا ملے جب خاک میں دانہ تو ہو برگ و ثمر پیدا
لکڑی جل کوئلہ بنے اور کوئلہ جل بنے راکھ
ہیں پاپیا ایسی جلی نہ کوئلہ بنی نہ راکھ

امجد کی دو نظمیں گزار دے اور میگزرہ دانی بلند پایہ ہیں کہ انہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ۔ ان کے ذریعہ امجد نے مایوس اور ناامید انسانوں کو امید کا پیغام دیا ہے ۔ ان کے تین تین بند پیش ہیں

## گزار دے

راہ خدا میں زندگی مستعار دے چھننے سے پہلے جامۂ ہستی اتار دے
ہر رفاہِ خستہ دلاں اشتہار دے غم دیدہ دل کے کان میں امجد پکار دے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

مانا کہ غم میں حد سے سوا مبتلا ہے تو بیکس ہے تو فقیر ہے تو بے نوا ہے
کیوں جان مستعار سے اے دل خفا ہے تو اے رونے والے موت کو بھولا ہوا ہے تو
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

پیوند خاک کا ہے یہاں نیک ہو کہ بد اے سونے والے عہد کا انجام ہے لحد
اے جینے والے مردوں پہ کرتا ہے کیوں حسد شاید نہیں نفس نفس واپسیں بود
تھوڑی سی رہ گئی اسے بھی گزار دے

# میگزرد

سال و مہ روز و شب شام و سحر میگزرد　　خیر و شر عیش و تعب نفع و ضرر میگزرد
کارواں ہمہ عالم زنظر میگزرد　　باش رنجیدہ کہ خوش حال مگر میگزرد
از ہوسہا بگزریا مگز میگزرد

عمر اک دن ہو کہ سو سال گزر جاتی ہے　　دوش پر کملی ہو یا شال گزر جاتی ہے
راہیروں کی بہ اقبال گزر جاتی ہے　　بیکسوں کی بھی بہر حال گزر جاتی ہے
از ہوسہا بگزریا مگز میگزرد

خاک میں کاخ نشین خاک نشین یکساں ہے　　بند کی آنکھ تو پھر زشت و حسین یکساں ہے
پیٹ میں لقمہ تر نان جویں یکساں ہے　　آگئی نیند تو پھر فرش و زمیں یکساں ہے
از ہوسہا بگزریا مگز میگزرد

**قطعات** امجد نے دیگر اصناف شاعری کی طرح قطعات میں بھی طبع آزمائی کی ہے ان کی تعداد بہت کم ہے۔ رباعیوں کی طرح ان میں بھی حقائق و تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ ایجاز نگاری میں امجد کا قلم معجزے دکھاتا ہے۔ کسی شاعر کے کلام کی خوبی شعر کا پر اثر ہوتا ہے۔ شعر کی تاثیر ہی کامیاب شاعر کی دلیل ہے۔ اثر سے متعلق امجد کا قطعہ ملاحظہ ہو جو حقیقت کا اظہار ہے۔

کلام ایسا اکثر سنا ہو گا تم نے　　سنا آج اور کل اثر دل میں اُترا
کہو شعر ایسا جو ہو تیز خنجر　　اِدھر منہ سے نکلا اُدھر دل میں اترا

ذیل میں چند قطعے پیش ہیں :-

غم کے ہاتھوں سے روز بربادی | عمر بھر بے شمار موتیں ہیں
موت میں ایک بار مرنا ہے | زندگی میں ہزار موتیں ہیں

---

اس قطعہ میں واضح کیا گیا ہے کہ غم انسان کے لئے بہت بڑی مصیبت ہے۔ انسان کا دل جب غمگین ہوتا ہے تو کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کو غم سے نجات دلا کر مسرت سے بدل سکے۔ ہزاروں نعمتیں بھی اس غم کو نہیں بدل سکتی۔ اسی طرح اللہ کے نیک اور محبوب بندوں کے لئے زندگی خود غم سے کم نہیں جس کی وجہ سے وہ دنیا میں خوش نہیں رہ سکتے

انسان کے دل میں خوف کسی کا ضرور ہے | بے خوف زندگی تو بڑی خوفناک ہے
ممکن نہیں کہ فطرت اصلی بدل سکے | امجد ہزار پاک ہوا پھر بھی خاک ہے

---

انسان کے دل میں کسی نہ کسی کا خوف ہونا ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر زندگی خوفناک ہو جاتی ہے۔ نیز یہہ کہ انسان کی فطرت ہی میں یہہ بات داخل ہے کہ وہ نہ صرف اپنے برابر والوں سے ڈرتا ہے بلکہ ضرر و نقصان کے خیال سے اپنے سے کمتر مخلوق سے بھی خوفزدہ ہوتا ہے گویا انسان بے خوف ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے یہہ ثابت کیا گیا ہے کہ انسان اپنی فطرت کو ہرگز نہیں بدل سکتا۔

جہاں کو ناز ہے ہستی پر اپنی | میں اپنی ہستی پہ مر رہا ہوں

ملا ہے عیب سے لطف خاکساری تنزل میں ترقی کر رہا ہوں

اس قطعہ میں تصوف کی جھلک ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دنیا دار دنیا میں عزت کے طلب گار رہتے ہیں مگر ان کے برعکس صوفی کے پیش نظر آخرت کی زندگی اور عزت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ دنیوی عزت کی خواہش نہیں کرتا۔ بلکہ دنیا میں خاکسار بن کر رہنا پسند کرتا ہے۔ لیکن امجد کو خاکساری کا لطف ملنے کے بعد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی پستی پر مر رہے ہیں۔ قیامت کے تصور سے اور حشر کے خیال سے دنیا والے ڈرتے اور گھبراتے ہیں لیکن جو اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہوتے ہیں وہ حشر کے دن سے نہیں گھبراتے بلکہ اس کی آرزو کرتے ہیں کیونکہ اس کو وہ اپنے لئے فرحت تصور کرتے ہیں۔ اس خیال کی تشریح امجد ذیل کے قطعہ میں کرتے اور بتاتے ہیں کہ زندگی کی شرح حشر سے ہوتی ہے۔

کیا خوف ہے آتش سقر سے انکو جو دل کی لگی کو دل لگی کہتے ہیں
جس کو سمجھتے ہیں حشر دنیا والے ہم تو اسے شرح زندگی کہتے ہیں

خدا اور بندہ کے تعلق کو ظاہر کرتے ہوئے امجد کہتے ہیں کہ خدا ہر اس شخص کا ہے جو دل سے اسے پکارا کرتا ہے۔

امجد اس میں کسی کی تخصیص نہیں جو مجھکو پکارتا ہے اس کا ہوں میں
سنتا ہوں صدائے دردِ ہر بیکس کی ملنے والے سے دل سے ملتا ہوں میں

تقدیر اور تدبیر کی نسبت کو ظاہر کرتے ہوئے امجد نے تقدیر کی برتری کو ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ خدا سے نسبت رکھے

اور بند دل سے نہیں۔

لاکھ اپنی فطرت سے تم تدبیر کئے جاؤ — آخر وہی ہوتا ہے جو اس کی مشیت ہے
تم ساتھ رہو اس کے جو ساتھ تمہارے ہے — غیروں کی معیت تو میت کی معیت ہے

ذیل کے قطعہ میں امجد نے امید و بیم کا نقشہ کس خوبصورتی سے کھینچا ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ جس میں خاک اور کاخ کے فلسفہ کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

ہر اک ذرہ کبھی ہے امید کا مرکز — ذرا سی دیر میں پھر خوفناک ہوتا ہے
بلند ہو کے یہی خاک کاخ بنتی ہے — زمیں پہ گر کے یہی کاخ، خاک ہوتا ہے

---

**مثلث** | امجد نے مثلث میں بھی طبع آزمائی کی ہے مثلث میں ہر بند کے تین مصرعے ہوتے ہیں۔ یہاں بھی امجد کا وہی ناصحانہ رنگ کارفرما ہے۔ کہتے ہیں:۔

کوئی دوست ہو کہ دشمن اسے سمجھو اپنے جیسا
کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
جو تمہارے ساتھ ہوتا تمھیں ناگوار ہوتا

---

**مستزاد** | مستزاد میں کسی غزل یا رباعی کے ہر مصرعے کے بعد اسی وزن کا ایک ٹکڑا اضافہ کر دیا جاتا ہے جو شاعری میں مشکل مقام ہے۔ بہت کم شعرا نے اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ امجد کے مستزاد کے نمونے ذیل میں پیش ہیں۔

---

# الحمد لی

مجھے ہر قسم کی تعریف کا شایاں سمجھو — میرا ہمسر ہے کہاں
اوج خوبی کا مجھے مہرِ درخشاں سمجھو — مجھ سے روشن ہے جہاں
میری تعریف کرو میری تعریف کرو

---

صرف اک حضرت امجد ہیں جہاں میں حضرت — بندۂ خاص قدر
باقی مخلوق کو ان سے نہیں کوئی نسبت — واہ جی واہ جی وا
میری تعریف کرو - میری تعریف کرو

---

عظمت اللہ خاں کے انتقال پر امجد نے منظوم مرثیہ لکھا تھا جو اپنی آپ نظیر ہے۔

## العظمۃ للہ

تقدیر نے دکھلایا عجب واقعہ ناگاہ — العظمت للہ
بجلی سی گری خرمنِ امید پہ ناگاہ — العظمت للہ
رخصت ہوا دنیا سے عجب دوست ہمارا — تھا آنکھ کا تارا
ہر دوست کا دل شدتِ غم سے ہوا پارا — العظمت للہ

---

وہ پھول جو مرجھا گیا کھلنے ہی سے پہلے — العظمت للہ

وہ جو تھا بہت عمر میں کم عقل میں بوڑھا — اس سے بھی زیادہ
اڑتیس برس میں کیا دنیا سے کنارا — العظمت للہ

---

ظالم نے نہ کچھ رحم کیا ایسے حسیں پر — خاک ایسی زمیں پر
یہ چادر خاک، اور رخ ماہ جبیں پر — العظمت للہ
ان چھوٹے سے بچوں کو کیا کس کے حوالے — ہیں نازوں کے پالے
اک مادر بیوہ، انھیں کس طرح سنبھالے — العظمت للہ

---

رو دھو کے تجھے کر دیا مولا کے حوالے — اے جو بیٹیوں والے
اللہ تجھے کیوں قرب میں اپنے نہ بلالے — العظمت للہ

---

**غزلیات** اردو شاعری کی بنیاد فارسی شاعری پر رکھی گئی تھی اس لئے فارسی شاعری کے تمام لوازمات اردو شاعری میں منتقل ہو گئے۔ وہی شیریں فرہاد کی محبت کے قصے لیلیٰ مجنوں کی عشقیہ داستانیں۔ وہی مے و ساقی اور گل و بلبل کے افسانے۔ وہی زاہد و عابد اور رند کی چشمک اور یہی لفت جز شاعری بن گئے۔ چونکہ غزل کا اصلی موضوع حسن و عشق ہے اس لئے اس میں حسن و جمال کی کیفیتیں اور عشق و محبت کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔ ہمارے شاعروں کا یہی میدان ابتدائی جولانگاہ تھا۔ شاعری کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ دور جدید کے سوا اردو شاعری کا تمام تر سرمایہ غزل ہی تھی جو بہت اہم صنف ہے اس لئے اردو غزل میں بھی معشوق سے

راز و نیاز۔ اس کی مدح و ستائش ناز و انداز غمزہ و عشوہ کے کرشمے جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

چونکہ امجد صوفی منش شاعر ہیں اس لئے ان کی غزلوں میں عشق و محبت کے افسانوں اور ساقی و مے۔ رُباب و کباب کی رنگین داستانوں کی بجائے حقیقت و صداقت اور معرفت و فلسفہ کے مضامین زیادہ ہیں۔ ان کی غزل میں عشق مجازی کے بجائے عشق حقیقی کی بجلیاں کوندتی ہیں۔ امجد کی غزل سادہ اور عام فہم ہونے کے باوجود خیال و مضمون کی گہرائی سے مالا مال ہے۔ تصوف اور فلسفہ جیسے گنجلک اور خشک مضامین کے باوجود امجد کی غزل غزل کے روایتی مزاج اور اس کی نزاکت اور اثر انگیزی سے کسی طرح عاری نہیں۔ امجد نے دراصل اپنی غزل کے ذریعہ ثابت کر دیا ہے کہ فلسفہ اور تصوف بھی شاعری کے مضمون بن سکتے ہیں اور غزل جیسی نازک مزاج صنف شاعری بھی ان کا بار اٹھا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر چند غزلیں اور بعض کے اقتباسات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا ۔۔۔ کوئی تم سا نظر نہیں آتا
ڈھونڈتی ہیں جسے میری آنکھیں ۔۔۔ وہ تماشہ نظر نہیں آتا
اپنی آنکھوں سے اُس کو دیکھونگا ۔۔۔ مجھے ایسا نظر نہیں آتا
ہو چلی ختم انتظار میں عمر ۔۔۔ کوئی آتا نظر نہیں آتا
جھولیاں سب کی بھرتی جاتی ہیں ۔۔۔ دینے والا نظر نہیں آتا
جو نظر آتے ہیں نہیں اپنے ۔۔۔ جو ہے اپنا نظر نہیں آتا
دیکھ لیتا ہوں صورت آئینہ میں ۔۔۔ داغ دل کا نظر نہیں آتا

زیر سایہ ہوں اس کے میں امجد
جس کا سایہ نظر نہیں آتا

غالب کی غزل پر امجد نے بھی ایک غزل کہی ہے۔ غالب کی غزل کا مطلع ہے۔

"عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا"

اس پر امجد کی غزل ملاحظہ ہو۔

باغباں کی محنت سے آپ کو رہا پایا
جس نے غنچۂ دل کو باغ دلکشا پایا

تیرے وصل کی خواہش ایک غلط نمائش ہے
اپنے آپ کو میں نے تجھ سے کب جدا پایا

ناامیدی و امید، ساتھ ساتھ چلتی ہیں
بارہا اسے کھویا اور بارہا اسے پایا

سانس جس کو کہتے ہیں ایک پھانس ہے دل میں
زندگی کے دھوکے میں موت کا مزا پایا

ہم تو صاف کہدیں گے مل گیا خدا اس کو
جس نے اس خدائی میں بندۂ خدا پایا

---

جستجو ہی اے امجد راز کامیابی ہے
جس نے جا بجا ڈھونڈا اس نے جا بجا پایا

یہ واقعہ ہے کہ انسان موجودہ چیز کی خواہش نہیں کرتا کیونکہ اس سے اس کا دل سیر ہو جاتا ہے بلکہ اس چیز کی خواہش کرتا ہے جو اس سے بالاتر ہوتی ہے یا جو اس کے پاس نہیں ہوتی۔ اس خیال کو غزل کے پہلے شعر میں امجد نے کس نازک خیالی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یعنے غنچۂ دل جب خود باغ دلکشا ہے تو پھر کسی اور باغ کی کیا ضرورت۔ امید اور نا امیدی کی تشریح کرتے ہوئے آگے کہتے ہیں کہ دنیا میں انسان جب تک زندہ ہے اس کو ہمیشہ امید اور نا امیدی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ انسان کی زندگی ان دو حالتوں میں سے کسی نہ کسی ایک میں ضرور ہوتی ہے اور زندگی کے لئے یہ لازم و ملزوم ہیں۔ ایک اور شعر میں سانس کی اصلیت اور زندگی و موت کے فلسفہ کو دیکھئے کہ کس قدر آسان اور سادہ الفاظ میں حل کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ سانس جس پہ زندگی کا انحصار ہے اور جس کے سبب زندگی، زندگی کہلاتی ہے اس کی حقیقت ایک پھانس سے زیادہ نہیں جو انسان کے جسم میں پھنسی رہتی ہے جیسے ہی یہ پھانس جسم سے نکلی زندگی کا خاتمہ ہوا اور موت واقع ہوئی۔

آگے چل کر اس حقیقت کو فاش کرتے ہیں کہ جس نے دنیا میں خدا کی مخلوق کو محسوس کیا اور خدا کے بندوں سے انس و محبت کے ساتھ پیش آیا تو گویا اس نے اس دنیا میں خود کو پا لیا یعنے خدا کو پانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے اس کے بندوں کی حقیقت اور ان کے مقام کو پا یا

جائے۔ اگر کسی نے خدا کے بندوں کو اس دنیا میں نہ سمجھا تو پھر اس کے لئے خدا کے مقام کو سمجھنا بہت مشکل ہے اس لئے امجدؔ کہتے ہیں کہ بندوں کے مقام کو جس نے سمجھا تو یہ سمجھ لو کہ اس نے خدا کو سمجھا اور اسے پالیا۔

فلسفۂ جستجو کو نہایت آسان طریقہ سے حل کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انسان کی زندگی کی کامیابی کا راز اگر کچھ ہے تو وہ صرف جستجو اور کوشش ہے کیونکہ نپولین کے خیال کے مطابق "کوئی چیز ناممکن نہیں" اور قائد اعظم محمد علی جناح کے نزدیک (Failure is a word — unknown to me) اسی طرح امجدؔ بھی کہتے ہیں کہ کوشش ہی کامیابی کا راز ہے جو کوشش کرتا ہے وہی کامیاب بھی ہوتا ہے۔

امجدؔ نے غالبؔ کی طرح متعدد غزلیں لکھی ہیں۔ ذیل کی غزل ان میں سے ایک ہے

کام کب حسبِ مدعا نہ ہوا؟ — اس کے فضل و کرم سے کیا نہ ہوا؟
ہم تو اک بار اس کے ہو جائیں — وہ ہمارا ہوا ہوا نہ ہوا
ڈھونڈتا ہوں میں ہر نفس اس کو — اک نفس مجھ سے جو جدا نہ ہوا
کیا ملا وحدتِ وجودی سے — بندہ بندہ رہا خدا نہ ہوا
جا چکے ہوش و عقل و تاب و تواں — لیکن افسوس انا فنا نہ ہوا
بندگی میں یہ کبریائی ہے — خیر گزری کہ میں خدا نہ ہوا

ایسے آقا کا ہے غلام امجدؔ
جس کے مانند دوسرا نہ ہوا

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ تصوف کا اہم مسئلہ خدا کو جاننا اور پہچاننا ہے اور امجد کی شاعری کا زیادہ تر حصہ تصوف پر ہی مشتمل ہے چنانچہ اوپر کی غزل میں امجد نے اسی سادگی اور ادا کے ساتھ توحید باری تعالیٰ۔ معرفت الٰہی اور عبدیت کے اہم مسائل کو واضح طور پر بیان کیا ہے جس سے آج کل کے نام و نمود چاہنے والے صوفیا کا پردہ چاک ہو کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح بندگی میں خدائی کرتے ہیں۔

ذیل کے اقتباسات سے امجد کی شاعری میں تصوف کی خاص جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

عالم میں ہر اک اس کا شیدا نظر آتا ہے ۔۔۔ اس طور کا ہر ذرہ، موسیٰ نظر آتا ہے
بندے کی معیت میں مولا نظر آتا ہے ۔۔۔ قطرے کی حقیقت میں دریا نظر آتا ہے

کس طرح نظر آئے وہ پردہ نشیں امجد
ہر پردے کے بعد اور اک پردہ نظر آتا ہے

جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کو معمولی انسان کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی اسی طرح صوفی کامل بھی ہر وقت اس کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی نہیں کر سکتا۔ البتہ اس کا جلوہ اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ گویا معشوق حقیقی پردہ میں ہوتا ہے اس لئے پردہ کی تشبیہ سے کلام میں خاص خوبی پیدا ہو گئی ہے۔

امجد نے خواجہ میر درد کی غزل

"آہ پردہ تو کوئی مانع دیدار نہیں ۔۔۔ اپنی غفلت کے سوا کچھ در و دیوار نہیں"

کی طرح پردہ کو اپنے خاص رنگ میں پیش کیا ہے اور کہتے ہیں کہ پردہ نشین کی پردہ نشینی کا یہ حال ہے کہ جب ایک پردہ اٹھتا ہے تو دوسرا پردہ آجاتا ہے جس کے سبب خالق مطلق کا نظر آنا ممکن ہی نہیں۔

جے پور میں ایک کل ہند مشاعرہ ہوا تھا جس میں ہندوستان کے اکثر بڑے شعرا جمع تھے۔ سر اکبر حیدری (حیدر نواز جنگ) نے اس موقع پر امجد سے غزل کہنے کی فرمائش کی۔ طرحی مصرع "آئے نہ بے نقاب مرے خیال میں" تھا جس پر امجد نے طبع آزمائی کی۔

آفت ہے آئے دن طلب ملک و مال میں
راحت ہے دو جہان کی ترک سوال میں

کہتے ہیں "وہ بلند ہے وہم و خیال سے"
یہ بھی ہے اک خیال ہمارے خیال میں

دیکھو خدا کی شان وہ آئے ہیں میرے گھر
جو آج تک نہ آئے کسی کے خیال میں

جب تک رہا فراق، رہی ان کی جستجو
اب ہیں کہ خود کو ڈھونڈ رہے ہیں وصال میں

دیکھو نہ کم نگاہی سے امجد فقیر کو
آب حیات ہے اسی جام سفال میں

امجد کی ایک مشہور نعتیہ غزل "کس چیز کی کمی ہے مولا تری گلی میں" جو مدینہ منورہ میں لکھی گئی تھی۔ اس کو ممکن ہے کہ بعض اہل عقل اپنے نزدیک دیوانہ کی دیوانگی سمجھیں اور امجد کے خیال کے مطابق "دیوانگی پہ میری ہنستے ہیں عقل والے" صحیح ہو جائے۔ لیکن اس غزل میں جن اعلیٰ متصوفانہ خیالات کو جس سادگی سے بیان کیا گیا ہے وہ امجد کی قدرت بیان کا بہترین ثبوت ہے۔

کس چیز کی کمی ہے مولا تری گلی میں — دنیا تری گلی میں عقبیٰ تری گلی میں
جامِ سفال اسکا تاجِ شہنشہی ہو — آ جائے جو بھکاری داتا تری گلی میں
دیوانگی پہ میری ہنستے ہیں عقل والے — تیری گلی کا رستہ پوچھا تری گلی میں
ہے فیض کی تجلی گہری اندھیریوں میں — بکتا ہے رات ہی کو سودا تری گلی میں
توحید کی تجلی سب پہ جدا جدا ہے — کرتے ہیں بے سمجھ کیوں جھگڑا تری گلی میں
امجد کو آج تک ہم ادنیٰ سمجھ رہے تھے — لیکن مقام اس کا دیکھا تری گلی میں

اللہ تعالیٰ کی ذات مثال سے بری اور بالاتر ہے لیکن جب تک کہ کوئی مثال نہ دیجائے اس کی تمثیل سمجھ میں نہیں آسکتی جس کی تشریح امجد اپنے مقطع میں کرتے ہیں۔

مثل و مثال سے بری حدِ مثال میں بھی آ — جاہ و جلال کے خدا شانِ جمال میں بھی آ
قسمتِ بد کو نیک کر ظاہر و باطن ایک کر — تو میرے قال میں بھی آ تو میرے حال میں بھی آ
تو ہی جہاں میں ہر جگہ پھر بھی نہیں کسی جگہ — نورِ زمین و آسمان چشمِ خیال میں بھی آ
مردہ دلی نکال دے جان میں جان ڈال دے — چشمۂ آبِ زندگی جامِ سفال میں بھی آ

## جواب کیا ملتا ہے

صبحِ سرور کے حریص شامِ ملال میں بھی آ — طالبِ ملکِ سروری شانِ سوال میں بھی آ
ذوقِ شنید تا کجا دید کا بھی تو لطف اٹھا — لذتِ قال ترک کر عالمِ حال میں بھی آ
نقدِ شکستگی یہاں لعل و گہر سے ہے گراں — بامِ کمال سے اتر حدِ زوال میں بھی آ
رشتۂ عبدیت نہ توڑ شیوۂ عاجزی نہ چھوڑ — بولہبی بہت ہوئی رنگِ بلال میں بھی آ
جامۂ کبر چاک کر خود کو خودی سے پاک کر — امجد منزلت طلب صفتِ نعال میں بھی آ

اوپر کی غزل کے تیسرے شعر میں امجد اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ بدقسمت کو نیک کر دے۔ چونکہ انسان کا ظاہر و باطن عام طور پر ایک سا نہیں ہوتا اس لئے ظاہر و باطن کا ایک ہونا ہی اخلاق کا بلند ہونا ہے جو اسلام کی اصل تعلیم ہے لیکن بدقسمتی سے اگر مسلمانوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیم جو اعلیٰ کردار قائم کرنا چاہتی ہے مسلمان اس سے بہت دور ہے کیونکہ مسلمانوں کے قول و فعل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کہتے کچھ اور ہیں کرتے کچھ اور۔ گویا ان کے قول و فعل میں بالکل یکسانیت نہیں۔ اور شارع اسلام نے انسان کو سب سے پہلا جو تعلیم دی وہ یہی اسلام کی بنیادی تعلیم ہے کہ انسان جو کچھ بھی جانتا ہے اس پر عمل کرے تاکہ اس کے ظاہر و باطن اور قول و فعل میں یکسانیت رہے اور یہی یکسانیت معیار انسانیت ہے۔

چوتھے شعر میں امجد خدا کی ہمہ گیر صفت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیری ہمہ گیریت کا یہ حال ہے کہ تو ہر جگہ ہے اور کوئی جگہ بھی تیرے وجود سے خالی نہیں یعنی کوئی ایسا مقام نہیں جہاں تو موجود نہ ہو لیکن اس کے باوجود تو کہیں نظر نہیں آتا۔ اسی تاثر کے تحت امجد کہتے ہیں کہ چونکہ تو نظر نہیں آتا اس لئے چشم خیال میں آتا کہ اگر تجھ کو چشم بینا سے نہ دیکھا جا سکے تو کم از کم تیرا تصور کیا جا سکے۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ تو چشم خیال میں آئے۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے امجد خود اپنی زبان سے جواباً مقطع میں کہتے ہیں کہ

چونکہ کبر و غرور انسان کی فطرت میں داخل ہے اور ذرا سی دولت یا علم پا کر انسان غرور اور متکبر ہو جاتا ہے اسلئے سب سے پہلے انسان کو غرور و تکبر سے دور رہنا چاہیے کیونکہ خدا کو جو چیز سب سے زیادہ ناپسند ہے وہ انسان کا غرور اور تکبر ہے اسلئے انسان کو چاہیے کہ غرور اور تکبر جیسی بُری بیماریوں سے پرہیز کرے۔

مزید چند غزلیں پیش ہیں جس سے انجد کی بلند خیالی اور اخلاقی تعلیم کے ساتھ ساتھ تصوف اور وحدت سے لگاؤ پر روشنی پڑتی ہے۔

کب سے ہے ابتدا نہیں معلوم ہے کہاں انتہا نہیں معلوم
آنے جانے میں سانس کے اب تک۔ کیا لیا کیا دیا نہیں معلوم۔
کس سے پوچھوں کہ شرم آتی ہے اپنے گھر کا پتہ نہیں معلوم
یہ میرا وہ میرا جہاں میرا میں ہوں کس کا ہوا نہیں معلوم
جس سے پورا ہو مدعا دل کا مجھے ایسی دعا نہیں معلوم
عمر ساری گذار کر انجد ہوا معلوم کیا؟ نہیں معلوم

---

کیسی مست شباب کی دنیا ایسی ہے جیسے خواب کی دنیا
مجھ کو غفلت ہے کائنات تمام ساری دنیا ہے خواب کی دنیا
موت ہیں دو جہاں کی راحتیں زندگی ہے عذاب کی دنیا
حرص دنیا میں پھنس کے لے انجد۔ تو نے اپنی خراب کی دنیا

---

کچھ طلب کرنا کسی سے آبرو کی موت ہے۔ آرزو کا پورا ہونا آرزو کی موت ہے

وہ اگر ملنے نہیں آئیں بھی ہے کچھ مصلحت — ان کے ملنے میں ہمارے جستجو کی موت ہے
آپ کے ہوتے ضرورت کیا شراب ناب کی — اس نشیلی آنکھ سے جام و سبو کی موت ہے
دیکھئے کب آتے ہیں جا آتے کس پہ وہ ہیں ـ تمنۂ جانا امجد کی اک بات سے گفتگو کی موت ہے
جب سند فقیری بیٹھ گئے — شاہی کی تمنا کون کرے

جب مالک کونین اپنا ہو! — کونین کی پروا کون کرے
مسجود اگر مشہود نہیں — پھر طاعت میں کچھ سود نہیں
مسجود کی جب تک دید نہ ہو — موہوم کو سجدہ کون کرے
ہر خواہش جان کی کاہش ہے — خواہش جو نہ ہو آسائش ہے
منشا نہیں جب اپنی کوئی — پھر عرض تمنا کون کرے
تم آؤ نہ آؤ وعدے پر — ہر حال میں راضی ہے امجد
تم جان اور دل کے مالک ہو — مالک سے تقاضا کون کرے
اک برق تجلی نے میری تعمیر کے ٹکڑے کر ڈالے — تدبیر کے ٹکڑے کر ڈالے تقدیر کے ٹکڑے کر ڈالے
پایا نہ عقاب جب تک اس بت کو اپنی پرستش کرتا تھا — ہاتھ آگئی جب اصلی صورت تصویر کے ٹکڑے کر ڈالے
بھولا ہے ابھی تک تھا جب تک آئی اسکو یاد وطن — اک شیم زدن میں قیدی نے زنجیر کے ٹکڑے کر ڈالے
غم میں میرا غمخوار آہی گیا رونے سے اسے پیار آ ہی گیا — تدبیر نے میری قسمت کا تقدیر کے ٹکڑے کر ڈالے
شہ رگ کے قریب اور رہتا تھا کس طرح گلا کٹ سکتا تھا — نازک سی رگ گردن نے مری شمشیر کے ٹکڑے کر ڈالے
افسانۂ غم کہنے کے لئے سوچے تو بہت کچھ تھے امجد — اک تیز نظر نے ظالم کی تقریر کے ٹکڑے کر ڈالے

# کلام امجد کی خصوصیات

کلام امجد پہ کیسی رائے کے پیش کرنے سے پہلے بہتر تو یہ ہے کہ خود امجد اور سرمد کی رائیں پیش کر دی جائیں۔ کیوں کہ امجد کے مرتبے کو یا تو خود امجد ہی جان سکتے ہیں یا سرمد جیسا بالغ نظر۔ خود امجد کی زبان میں سنئے :-

مجھے ہر قسم کی تعریف کا شایاں سمجھو — میرا ہمسر ہے کہاں
اوج خوبی کا مجھے مہر درخشاں سمجھو — مجھ سے روشن ہے زماں
میری تعریف کرو میری تعریف کرو

شاعری میں مجھے سعدی کا مماثل سمجھو — ہے میرا مثل کہاں
ساری دنیا میں فقط اک مجھے قابل سمجھو — میں ہوں استاد زماں
میری تعریف کرو - میری تعریف کرو

---

نظم میں نثر میں - تحریر میں - تقریر میں — کون ثانی ہے میرا
ہمہ دانی سے مری دنگ ہے سب ہند و عرب — مجھ سا دیکھا نہ سنا
میری تعریف کرو - میری تعریف کرو

اب امجد کی زبان میں سرمد سے سنئے :-

جب امجد و سرمد میں ملاقات ہوئی — شوریدہ سروں میں کچھ عجب بات ہوئی
امجد نے کہا کاش میں سرمد ہوتا — سرمد نے کہا کاش میں امجد ہوتا

امجدؔ کی زبان پر کلام سرمدؔ　　سرمدؔ کی زبان پر کلام امجدؔ
دو شمعوں میں اک ایک کا پروانہ تھا　　دیوانوں میں اک ایک کا دیوانہ تھا
توحید کا ہر ایک نمایندہ تھا　　ایک زندہ جاوید تھا ایک زندہ تھا

یہہ محض شاعرانہ تعلّی نہیں ہے بلکہ عین حقیقت ہے۔ خود امجدؔ ایوب کی زبان میں کہتے ہیں " اگر میں سچ مچ سچا بھی ہوں تو اس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں جتا سکتا۔ مجھے تو اس پاک ہستی کے مقابل میں اپنی تحقیر ہی کرنی چاہئے۔

کس زور سے ہم اپنی ثنا کرتے ہیں　　دیکھیں تو ذرا غور سے کیا کرتے ہیں
جو لوگ کیا کرتے ہیں اپنی تعریف　　دراصل وہ تحقیر خدا کرتے ہیں

اسی تاثر کے تحت امجدؔ یوں کہہ اٹھتے ہیں :-

ممکن نہیں کہ فطرتِ اصلی بدل سکے　　امجدؔ ہزار پاک ہوا پھر بھی خاک ہے

ممکن ہے پچھلے اشعار امجدؔ کو حقیقت ناشناس نظروں کے سامنے خود ستا ٹھہرائیں لیکن اس خود ستائی کے محرکات پر غور کیجئے۔ وہ جو اپنے مصدر و مرکز سے مل چکا تھا جس کی نظر سے دنیا کے سارے اعتبارات اٹھ چکے۔ جس نے یہہ جان لیا کہ سارے رشتوں سے کٹ کر رشتۂ حقیقی سے مل جانا عین سعادت ہے۔ اس کی نظر میں ہر شئے کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔ مادی اعتبارات کے درمیان وہ جانتا ہے کہ وہ ارفع و بلند ہے اور اسی لئے یہہ کہتے نہیں چوکتا کہ " مجھے ہر قسم کی تعریف کا شایان سمجھو" کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ اپنے رب اور محبوب کے نزدیک مقبول ہو چکا لیکن

جُونہی اس کی نظر میں عبد و معبود کے مقامات آجاتے ہیں اسے اپنے رب کے آگے اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔

خاک ہے خاکسار ہے امجدؔ رہ گذر کا مزار ہے امجدؔ

## شاعری جزویست از پیغمبری

شاعری اقبال کی زبان میں جزو پیغمبری جس حد تک شاعری فطرت اور مظاہرہ فطرت کی نقاب کشائی کا فرض اپنے ذمہ لیتی ہے اس حد تک وہ محض نقل ہے۔ لیکن اس حد سے گذر کر جب اس کے لوازمات میں سوچے سمجھے اور منضبط پیغام اور انسانیت کے لئے راہیں متعین ہونے لگتی ہیں تو وہ محض جادوگری سے آگے بڑھ کر ایک اخلاقی قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور شاعر انسانیت کی رگوں میں وہ آگ بھرنے لگتا ہے جو یا تو پیغمبری کی امتیازی خصوصیت ہے یا خلاق ازل کی۔ لیکن شاعری کی ایک اور خصوصیت ہے۔ جو شاعری کو شاعری بناتی ہے۔ اور ہمارے لئے اظہار کی ایک نئی گنجائش فراہم کرتی ہے۔ وہ ہے حسن کاری اور اظہار جذبات کی خصوصیت۔ شاعری میں جس عنصر کو جمالیاتی عنصر کہا جاتا ہے اس کے معنیٰ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ خارج سے ملنے والی ساری وغیر مادی تحریکات کو اپنی شخصیت میں سمو کر نئے معنیٰ پہنائے جائیں اور خود پُر اسرار گہرا ئیوں میں ڈوب کر ایک نیا زاویۂ نظر پیدا کرے۔ غرض جذبات اور خارجی تجربات کے ہم آہنگ اظہار کا نام شاعری ہے

امجد کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے۔

ایک لمحہ کے لئے امجد کے دوش بدوش کھڑے ہو کر دیکھئے۔ رودِ موسیٰ کی سرکش موجوں نے سارے شہر میں صفِ ماتم بچھا دی ہے۔ چاروں طرف تباہی و بربادی کی ہیبت ناک داستان پھیلی ہوئی ہے موجوں کے روپ میں موت۔ انسانی مقدر سے تمسخر پر تلی ہوئی ہے اور ایسے وقت میں نظروں کے سامنے ایک دلخراش منظر نمودار ہوتا ہے۔ ان کی بیوی، بچی اور والدہ بیدرد موجوں کے رحم و کرم پر سر پٹکتے ہوئے دھارے میں موت کی آغوشوں کی طرف رواں ہیں۔ اور ان میں اتنی سکت بھی نہیں کہ ایک ہاتھ آگے بڑھ کر ان کے لئے موت سے الجھ سکیں۔ کچھ وقت گذرتا ہے اور پھر سب کچھ فنا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک بے یار و مددگار تنہا، بےکس بے گھر اپنے سارے خاندان کا نوحہ کرنے کے لئے باقی رہ جاتا ہے۔ جن کے ظرف وسیع نہیں ہیں وہ شاید اس امتحان سے ثابت قدم نہ گزرتے اور کیا عجب ہے کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو ان ہی موجوں کے حوالے کر دیتے۔ لیکن وہ جن کے ظرف وسیع ہیں زندہ رہ جاتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ موسیٰ کے دیئے ہوئے غم کو نئے معنی پہنائیں نئی تاویل دیں اور غیر معمولی جذبات و احساسات کو نئی ساحری بخشیں۔ اس طرح امجد کی زندگی میں موسیٰ کی لائی ہوئی بربادی ہمیشہ کے لئے منجمد ہو کر رہ گئی۔

ابتداً اس واقعہ کے بعد امجد زندگی سے مایوس ہو کر بہ الحزن تنے

بیان کرتے ہیں :-

یاد صرصر سے آشیاں گرتا ہے　　اب لشکرِ عیش کا نشاں گرتا ہے
اب جاؤں کدھر کہاں پناہوں یا رب　　پھٹتی ہے زمیں آسماں گرتا ہے

یہ سنتے کے بعد اللہ تعالیٰ امجد ہی کی زبان میں ارشاد فرماتے ہیں۔

بندہ ہے تو بندگی پہ قائم ہو جا　　مخدوم نہ بن کسی کا خادم ہو جا
مومن ہے تو ڈھونڈ۔ مر کوئی اس کی جا　　مسلم ہے تو سر جھکا کے نادم ہو جا

اس ارشاد کے سنتے ہی امجد پر حقیقت کھل جاتی ہے اور حقائق کے سارے راز منکشف ہو جاتے ہیں جس سے امجد کے پایۂ ثبات میں لغزش کی بجائے مزید استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اور یوں گنگناتے لگتے ہیں۔

تقدیر سے کیا گلہ خدا کی مرضی　　جو کچھ بھی ہوا۔ ہوا خدا کی مرضی
امجد ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں　　ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

امجد کے سارے کلام میں تصوف اور وحدت حق کی ولولہ انگیز جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر اور عظیم المرتبت انسان خدا رسیدہ صاحب باطن صوفی ہیں۔ ان کے دل کی آنکھ ہمیشہ کھلی رہتی ہے۔ ان کی نظر میں کائنات ایک آئینہ ہے جس میں وہ ذرہ ذرہ کو جیرانِ حُسن اور گوشہ گوشہ کو جلووں سے منور دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نگاہ معرفت بین ہے۔ خود کہتے ہیں :-

آیا ہے زمانہ ترقی　　گندہ بندہ خدا بنا ہوا ہے
ایمان سے دل کو صاف کر کے　　امجد صوفی بنا ہوا ہے

امجد کے کلام میں شعر کے اصلی محرکات۔ سادگی جوشِ عمل۔ اصلیت

فطرت۔ محبت، مذہب اور جذبات انسانی کی جاندار تصویریں۔ طرز ادا کی نزاکتیں اور فنی باریکیاں غرض کہ سب کچھ موجود ہے جس سے انکی قادرالکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے، وہ صنف، خاص جو ان کے کلام کی جان اور خیال کی روح ہے وہ رباعیات ہیں۔ رباعی گو شاعر کی حیثیت سے اردو ادب میں امجد کا کوئی جواب نہیں۔

قوتِ مشاہدہ شاعر کی اولین جادوگری ہوتی ہے۔ شاعر سادہ سے سادہ چیزوں میں ایسی خوبیاں دیکھتا اور بیان کرتا ہے جس کا اوروں کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ شاعر مصور فطرت ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے خیال کی نقاشی قدرت سے سیکھتا اور مشاہدہ سے کام لیتا ہے اور یہ امجد کے کلام کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ ہمیں مجاز سے حقیقت کی طرف لے جاتے ہیں۔ ایسے وقت میں جب کہ اس دور اور دنیا میں سائینس کی ترقی اور مغربی اثر کے تحت حق کی آواز سینوں کے اندر دفن اور گوش ذوق نغمہ سے خالی ہوں اور خدا پرستی کی بجائے خود پرستی اور دنیا پرستی میں انسان مبتلا ہو۔ حق کی آواز بلند کرنا اور نغمۂ توحید سے دنیا کو وحدانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا یہ امجد ہی کا کام ہے۔ لا الہ الا اللہ۔

نور مطلق پہ رُخ ترا شاہد ہے
سورج کے وجود پر ضیا شاہد ہے
ثابت ہوا لا الہ الا اللہ سے
شاہد ہے خدا کا تو خدا شاہد ہے

محمد الرسول اللہ

طیبہ ہی کو اب کعبۂ مقصد کہئے
ڈھلیز نبی کو سنگ اسود کہئے

گر حمدِ خدا کا حق ادا کرنا ہے دل سے اک بار یا محمد کہئے

نیز تعلیمات اسلامی سے متعلق امجد کہتے ہیں:-

دارو ئے لطیف دردِ ہنگامی ایزم یا آبِ حیات در تمنّامی ریزم
گویم بہ زبانِ حادث اسرارِ قدم درساغرِ نو۔ سئے کہن می ریزم

پروفیسر سلیم مرحوم نے امجد کے علم و فضل اور کمال شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے "امجد شعر گوئی کے وقت خیال کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ یہ اُن شاعروں میں نہیں ہیں جو لفظوں اور محاوروں کے کھلونے تیار کرتے رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں جا بجا وہی بجلی کوندتی نظر آتی ہے جو اہلِ بصیرت کے لئے ہوشربا ہے۔ وہ شعر اسی وقت کہتے ہیں جب کوئی خیال ان کو اپنے اظہار پر مجبور کرتا ہے پھر وہ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ اس خیال کو کس لباس میں ظاہر کریں۔ خود خیال ہی اپنے لئے لباس تیار کر لیتا ہے اور اس کو پہن کر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔ قدرتی شاعر کی یہی پہچان ہے۔ ان کی منتخب رباعیاں یقیناً زندہ رہیں گی۔ اور اردو ادب کا اہم عنصر خیال کی جائیں گی۔" (افاداتِ سلیم)

امجد کی شاعری کی اہم خصوصیت جو ان کے کلام میں زیادہ نمایاں ہے وہ پڑھنے والے کے قلب پر خاص نقش مرتسم کرتا ہے۔ امجد کے کلام میں غیر فطری اور غیر قدرتی واقعات کا ذکر نہیں ہے۔ وہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کا عمیق مطالعہ کرتے ہیں اور پھر زندگی کی کمزوریوں سے متاثر ہو کر دوسروں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خدا کے احکام کو اپنے کلام کے ذریعہ عوام تک پہونچاتے ہیں جو تخلیقِ انسانی کا سب سے مقدم فرض

اور اہم مقصد ہے۔

امجد اپنی نظموں اور رباعیوں کے ذریعہ عبد و معبود کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسانیت اور اخلاق کی تلقین کرتے اور ہمدردی کی تعلیم دیتے ہیں۔ امجد رسول اکرمؐ سے والہانہ عقیدت رکھتے اور اسلامی تعلیمات پر سختی سے عامل ہیں۔ امجد کی شاعری کے موضوع آیات قرآنی اور احادیث نبوی ہیں۔ امجد اپنی مضامین کو اپنی جدت طبع سے نہایت سادہ سلیس اور عام فہم زبان میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دل میں اتر جاتے ہیں۔ امجد کی قوتِ بیان کا یہ عالم ہے کہ مشکل سے مشکل اور ادق سے ادق مضامین بھی دلچسپ بن جاتے ہیں۔ اور امجد کا کلام وجد سے خالی نہیں ہوتا عام طور پر جدت طرازی اور انوکھے پن کی وجہ سے شاعرانہ حسن مفقود ہو جاتا ہے لیکن امجد کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ اعلیٰ شاعری صنعت گری کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ امجد کی شاعری کے مخصوص اعجاز اور دریا بیان، حسن کارانہ سادگی اور اختصار کی خوبی کے ساتھ اس کا نا ثر ہے۔ امجد قدرتی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ صوفی بھی ہیں۔ اس لئے ہر قسم کے کلام میں حتیٰ کہ غزل میں بھی اپنے صوفیانہ خیالات و جذبات کو نہایت سادگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

امجد انسانی ترقی کے لئے انسانیت کا ایک اعلیٰ و ارفع پیام دیتے ہیں جو تمام انسانی پیاموں سے افضل و برتر ہے۔ امجد کا پیام الہامی ہے جس کی بنیاد آیاتِ قرآنی اور احادیث ہیں۔

امجد کی شاعری جذبات اور احساسات کی شاعری ہے وہ اس وقت شعر کہتے ہیں جب دل میں کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ امجد کے قدرتی شاعر ہونے کی پہچان یہی ہے کہ وہ دوسروں کے جذبات کو بھی بالکل اسی طرح ادا کرتے ہیں گویا کہ وہ خود ان کے اپنے جذبات ہیں۔

ہر دور میں شاعری کا بڑا حصہ مدح تھی جو شعرا کی زندگی کا بڑا سہارا تھی۔ اسی کے ذریعہ سے شعراء اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ امجد نے شاعری کے چہرے سے اس بدنما دھبہ کو مٹایا۔ وہ تنگ حال بھی رہے اور پریشان حال بھی۔ لیکن انہوں نے کسی صلہ یا انعام کی خاطر مدحیہ قصائد لکھ کر کسی کو خوش کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اپنی تصانیف کو کسی سے منسوب کیا سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے۔ اس فرض کو امجد نے نہایت خوبی اور نفس کشی کے ساتھ ادا کیا۔ جس کی نظیر تاریخ شاعری میں بمشکل مل سکتی ہے۔ ورنہ ہر بڑے سے بڑے شاعر نے اپنے زمانہ کے امراء و سلاطین وقت کی نہ صرف مدح سرائی کی بلکہ صلہ میں انعام و اکرام بھی پاتے رہے لیکن امجد کی شاعری کا دامن ان بدنما دھبوں سے پاک ہے۔ کیونکہ امجد جانتے ہے کہ ان کی زبان کسی کی حمد و ثنا کر سکتی ہے تو وہ اللہ کی ذات اور اس کے رسول کی شخصیت ہے۔ ان کی گردن جھک سکتی ہے تو صرف خدائے واحد کے آگے اور در کعبہ پر ان کا دستِ طلب دراز ہو سکتا ہے تو صرف مسبب الاسباب کی طرف۔ اس لئے امجد نے ہمیشہ اپنے کو دنیوی علایق سے الگ رکھا اور اپنی ذیل کی رباعی کا ار بند نظر آتے ہیں۔

امجد کے کمالِ شاعری کا اصلی معیار ان کا پیرایۂ ادا ہے۔ ان سے زیادہ کوئی شخص اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ کسی مضمون کے موثر بنانے کا سب سے اچھا طریقہ کونسا ہے۔ جن جن مضامین کو امجد نے لیا ہے اور جس پیرایہ میں ادا کیا ہے متقدمین اور متاخرین میں اس سادگیٔ بیان اور پیرایۂ ادا کی نظیر نہیں ملسکتی۔ امجد کا کلام سلیس اور عام فہم ہے۔ نازک خیالی امجد کے کلام کی خاص خوبی ہے۔ ان کے کلام کی اگر نثر کی جائے تو بعض اوقات صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ تو نثر ہے جو محض حُسنِ ترتیب اور عمدہ انتخاب کی بدولت نظم معلوم ہوتی ہے۔

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

لطیف تمثیلوں اور برجستہ تشبیہوں سے کلام میں ندرت پیدا ہوجاتی ہے امجد کے کلام میں تاثر بھی زیادہ ہوتا ہے جو درد و الم میں ڈوبا ہوا اور اکثر سوز و گداز کی تصویر معلوم ہوتا ہے۔ اس میں پند و نصائح کے ساتھ تصوف و اخلاق کے چشمے اُبلتے نظر آتے ہیں۔ امجد مسلمان ہیں لیکن ان کا پیام اور تعلیم صرف مسلمانوں کی حد تک نہیں بلکہ عام انسانوں کی فلاح و بہبود بھی اسمیں مضمر ہے۔ وہ اپنے پیام کے ذریعہ انسان کو زیورِ انسانیت سے آراستہ کرنا اور صحیح معنی میں مجسمۂ اخلاق اور پیکرِ کردار بنانا چاہتے ہیں۔ وہ انسانوں کو نیک کام کی تلقین کرتے اور اچھے اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کی اصل بنیاد ہیں۔ امجد نے قرآن اور اسلامی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور مذہب پر

وسیع نظر رکھتے ہیں جس کی وجہ اسلامی مسائل اور عقائد کے ذکر سے ہٹ کر امجد کے پاس اپنی شاعری کے لئے اور کوئی موضوع نہیں۔

انسانی زندگی محض مادی احتیاجات کی تکمیل کا نام نہیں ہے۔ مادی احتیاجات کی تکمیل انسان کے ظاہری وجود اور اس کی شخصیت کے مادی رُخ کو تو آلودہ کر سکتی ہے لیکن اس مادہ کے آگے بھی اس کا ایک وجود ہے وہ ہے اس کی روحانی تلقین اور جذباتی آسودگی کا رُخ۔ انسان جب اس حیثیت سے اپنے اور اپنے گردوپیش پر نظر ڈالتا ہے تو اتنی بڑی کائنات میں اسے ایک ایسی حقیقت ضرور نظر آتی ہے جس کے کل سے اس کے جزنے اکتابِ حیات کیا تھا۔ دراصل اس کل کی خواہش۔ مذہب وعقیدہ اور علم وفلسفہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور یہیں سے شاعرانہ عرفان وادراک کی سرحد شروع ہوتی ہے شاعری اور فلسفہ سوائے آرزو کرنے اور اپنے جذباتی میلانات کی آسودگی کے اور کیا ہے اور اگر اقبال کی زبان مستعار لی جائے تو اس میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔

فلسفہ وشعر کی اور حقیقت ہے کیا ؎ حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

امجد کی شاعری کی بنیاد دراصل توحید الٰہی اور مرکز اسلام ہے۔ اس کے بغیر امجد کی شاعری کو سمجھنا مشکل ہے۔ کائنات کیا ہے۔ خالق کائنات کون ہے۔ کائنات اور خالق کائنات میں باہم کیا تعلق ہے اور اس میں انسان کا مقام اور اس کی اپنی ہستی کیا ہے۔ یہ وہ سوالات ہیں جنکو حل کرنے کے لئے انسان کو مذہب و فلسفہ کی طرف رجوع ہو کر ان کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔ ان سوالات کا تشفی بخش جواب مذہب اور فلسفہ دونوں نے دیا لیکن دونوں کے نقاط نظر میں

عظیم فرق ہے۔ مذہب وجدان کی روشنی میں دیکھتا ہے اور فلسفہ عقل کی مذہب یقین کے سہارے چلتا ہے اور فلسفہ استدلال کے بل پر۔ مذہب کا مقصود علم کی روشنی میں عمل کرنا ہے اور فلسفہ کی غرض علم برائے علم۔ اس کو عمل سے کوئی واسطہ نہیں۔

مذہبی اور فلسفی کے سوا ایک تیسری ہستی بھی ہے جو اس سنگلاخ وادی میں گامزن نظر آتی ہے۔ اور وہ ہے "شاعر" شاعر کا زاویہ نگاہ خالص مذہبی ہوتا ہے نہ خالص فلسفیانہ۔ مذہبی اس لئے نہیں کہ اس کو دنیائے عمل سے کوئی واسطہ او تعلق نہیں اور فلسفیانہ اس لئے نہیں کہ خشک علمی مباحث اس کی سرحد سے دور ہیں۔ شاعر کائنات عالم کا گہرا مطالعہ کرتا اور اس کی حقیقت وتخلیق سے متاثر ہو کر اپنے کلام کے ذریعہ سے ان تاثرات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ شعر کے ظاہری حسن وقبح کو دیکھنے والے کلام میں سلاست، روانی۔ الفاظ کی شوکت اور بندش کی نزاکت۔ محاوروں کا استعمال اور زبان کا لطف ڈھونڈتے ہیں مگر شعر میں یہی سب کچھ نہیں بلکہ ایک حقیقی شاعر کا پیغام اس کے سمجھنے اور سننے والوں کے نام زمانہ کے لا متناہی سلسلہ تک چلا جاتا ہے۔ مظاہر فطرت کی صحیح ترجمانی اور حق گوئی اس کو زمان ومکان کے قید وبند سے آزاد کرتی ہے آج اس کو نہ سمجھنے والی دنیا کل سمجھنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کے پیغامات وردِ زبان ہو جاتے ہیں۔

ہیگل نے اسی لئے شاعری کو حقیقتِ مطلق کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا ہے شعر وادب کا تعلق چونکہ انسانی زندگی سے ہے اس لئے ان کا مقصد سماجی

اصلاح ہونا چاہیئے۔ اگر سماج میں شعر و ادب کی غلط اقدار کا رواج ہو جائے تو پھر سماج میں اصلاح کی بجائے خرابی پیدا ہو کر سماجی زندگی متاثر ہو جاتی ہے انسان سے اچھے اور نیک عمل سرزد ہونے کی بجائے برے اور خراب عمل کا صدور ہونے لگتا ہے اور معاشرے میں تباہی و بربادی پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز سماج کے افراد میں وہ خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں جو قوم کو انحطاط اور زوال کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس لئے ادب و شعر کے پیش نظر سماجی تعمیر کا بلند مقصد اور انسانی اخلاق و کردار کا اعلیٰ نصب العین ہونا چاہیئے اور سماجی تعمیر کا یہ بلند مقصد اور انسانی اخلاق و کردار کا اعلیٰ نصب العین ہی امجد کی نثر و نظم دونوں کا مرکز و محور ہے۔ جس پر امجد کے ادب اور شاعری کا انحصار ہے۔

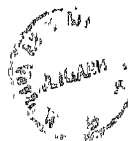
امجد کی ساری شاعرانہ اور ان کی ساری نثری تخلیقات میں دراصل شروع سے آخر تک رودِ موسیٰ کی طغیانی موجیں مارتی نظر آتی ہے یعنی بقول اور آزمائش و ابتلا کا حد سے گزر جانا انسان کے لئے کبھی کبھی "علاجِ درد" کا سامان بن جاتا ہے اور وہ جو غالب نے کہا ہے کہ "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" اس کی بہترین اور زندہ تفسیر امجد کی زندگی اور ان کی شاعرانہ بلاغتیں ہیں۔ اگر امجد کی زندگی میں طغیانی رودِ موسیٰ کا حادثہ نہ ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ امجد ایک باکمال شاعر تو بن جاتے لیکن جو سوز و گداز۔ تاثیر اور جو گھلاوٹ ان کے کلام میں آج نظر آتی ہے اس کا پتہ کبھی نہ ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اساتذہ کی صف میں آ جاتے اور بس۔ لیکن آج امجد کی شاعری میں جو بجلی کوندی نظر آتی ہے" وہ شاید امجد کی شاعری کو اس طرح نکھار کر ٹیلے ہوئے دلوں

کی تسکین کا سبب نہ بنتی۔ مذہب اور تصوف عام طور پر ٹوٹے ہوئے دلوں کی تسکین کے لئے مسیحائی کی سی کیفیت رکھتے ہیں اور جو غم زمانہ کے تغیرات کے ہاتھوں مل جاتا ہے اس کی صورت بدلنے اور اسکو اظہار کا ایک نیا سلیقہ اور ایک نیا اسلوب عطا کرنے میں مذہب و عقیدہ اور سلوک و تصوف سے زیادہ کسی سے مدد نہیں ملتی۔ امجد کی شاعری، ان کا غم اور اُن کے غم کی پُرسوز لَے درحقیقت فیضان ہے اسی حادثہ جانکاہ کا جس کی امجد نے صورت بدل دی اور اپنے آپ کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔

---

لو تجھ سے لگائے میرا ملنے والا
اپنے کو بھلائے میرا ملنے والا
مولا میرے ہر دوست کو اپنا کر لے
تجھ سے مل جائے میرا ملنے والا

---



## کتاب کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب و رسائل سے استفادہ کیا گیا ہے


۱۔ ریاض امجد حصہ اول ......... حکیم الشعرا سید احمد حسین امجد حیدرآبادی

۲۔ " " دوم ......... " "

۳۔ رباعیات امجد حصہ اول ......... " "

۴۔ " " دوم ......... " "

۵۔ " " سوم ......... " "

۶۔ خرقۂ امجد (سی پیوند) ......... " "

۷۔ نذر امجد ......... " "

۸۔ جمال امجد ......... " "

۹۔ حج امجد ......... " "

۱۰۔ حکایات امجد ......... " "

۱۱۔ گلستان امجد ......... " "

۱۲۔ پیام امجد ......... " "

۱۳۔ ایوب کی کہانی ......... " "

۱۴۔ میاں بیوی کی کہانی ......... " "

۱۵۔ دکن میں اردو ......... مولوی نصیرالدین ہاشمی

۱۶۔ مکتوبات امجد ......... " "

۱۷۔ اردو شہ پارے ......... ڈاکٹر محی الدین قادری زور

۱۸ - مرقع سخن ......... ڈاکٹر محی الدین قادری زور
۱۹ - جدید اردو شاعری ..... پروفیسر عبد القادر سروری
۲۰ - گل رعنا .......... مولوی سید عبد الحی
۲۱ - اردو تنقید کا ارتقاء ..... ڈاکٹر عبادت بریلوی
۲۲ - نئے پرانے چراغ ...... پروفیسر آل احمد سرور
۲۳ - مقدمہ باقیات فانی ..... پروفیسر رشید احمد صدیقی
۲۴ - مقدمہ شعر و شاعری ..... مولانا حالی مرحوم
۲۵ - سب رس بابتہ ماہ فبروری ۵۵ء
۲۶ - رسالہ جامعہ بابتہ جون ۴۳ء
۲۷ - ہمایون بابتہ ماہ مئی ۲۷ء
۲۸ - سالنامہ ڈائمنڈ جوبلی امجد حیدرآبادی - ڈاکٹر محی الدین قادری زور
۲۹ - جواب سپاسنامہ ...... حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد حیدرآبادی
۳۰ - تاثرات جوش ...... جوش ملیح آبادی
۳۱ - پیام ماجد ......... مولانا عبد الماجد دریاآبادی
۳۲ - خط بنام امجد ....... مسٹر ٹی گرہیم بیلی

